پھلاں دے رنگ کالے

فائزہ افتخار

1urdu.com
saba
URDU PHOTO

1urdu.com

انتساب

اپنی پیاری بیٹی اسوہ کے نام

Saba
UrduPhoto.com

"پھلاں دے رنگ کالے" میرے تخلیقی سفر کے ابتدائی دور کی تحریر ہے اور میری پسندیدہ ترین تحریروں میں سے ایک اسی لیے جب ادارہ خواتین ڈائجسٹ نے میری تحریروں کو کتابی شکل میں لانے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے خود امتل کو یہ ناول تجویز کیا۔

اس ناول کے بارے میں ایک دلچسپ بات بتاتی چلوں کہ اس کی کہانی' واقعات' سب بے شک فرضی ہیں مگر کردار تقریباً" حقیقی۔ بسم اللہ جان' حضرتی' ڈاکٹر خوشنود' غٹ شنلے' رحیم گل' ارباب خٹک۔۔۔ یہ میرے بچپن کے بہت دیکھے بھالے کردار ہیں' جنہیں میں نے اس یقین کے ساتھ اس کہانی میں رقم کیا ہے کہ یہ ناول ان کی نظروں سے کبھی گزرے گا ہی نہیں۔ ان میں سے بیشتر آنکھیں اب ابدی نیند سو چکی ہیں۔

دوسری اہم بات جو اس ناول کو میری نظروں میں اہم بناتی ہے' وہ یہ کہ اس سے قبل میں نے کبھی طویل تحریر لکھنے کا حوصلہ نہیں کیا تھا۔ میں طبعاً" رسکی نہیں ہوں اور کچھ کچھ سہل پسند بھی' لیکن اس کہانی نے خود اپنا آپ مجھ سے لکھوایا اور مجھ میں یہ اعتماد بھی پیدا کیا کہ اگر میں چاہوں تو خود پر رسکی اور سہل پسند کا لیبل اتار سکتی ہوں۔

اس ناول میں میرا سب سے پسندیدہ کردار "ہومنہ" کا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس کے کردار کی ان تمام خوبیوں یا خصوصیات کو ٹھیک اس انداز میں قارئین تک پہنچا سکوں جس طرح انہوں نے مجھے متاثر کیا اور لکھنے پہ اکسایا۔

مجھ سے کہنے والوں نے اکثر پوچھا ہے کہ میری کہانیوں کا مرکزی کردار زیادہ تر مرد کیوں ہوتا ہے۔ اس سوال کا جواب تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ میں نے ایسا کبھی ارادتاً" نہیں کیا۔

یہ سچ ہے کہ میرے تخلیق کردہ کرداروں میں سب سے مضبوط اور تاثر انگیز کردار مرد ہوتے ہیں اور ان بہت سے کرداروں میں سے ایک "عاشر ملک" ہے۔ "سارے گلاب لے جانا" کا عاشر ملک۔

عاشر کوئی ماورائی کردار نہیں ہے' نہ ہی کوئی مثالی مرد۔ وہ اس معاشرے کا ایک عام مرد ہے۔ بہت سی ذہانت' وجاہت' کشش کے ساتھ ساتھ وہی روایتی فیوڈل رکھنے والا ایک مرد جو اپنے سے آگے کسی کو دیکھ نہیں سکتا۔ بالخصوص کسی عورت کو۔ جو رقابت کی آگ میں اپنے سگے رشتوں کو بھی بخشنے پہ تیار نہیں ہوتا۔

ایسا مرد جو عورت کی کسی لغزش کو معاف کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ ایسا مرد جو بری عورت کے بارے میں وہی فرسودہ نظریہ رکھتا ہے لیکن اس بہت عام سے مرد کے اندر کہیں ایک بہت خاص بات بھی موجود ہے جسے میں نے ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

اور یہی عام سے خاص اور خاص سے خاص تر بننے کا کیمیا ہے۔ یعنی خود احتسابی کا عمل' اس عمل سے گزر کے ہی عاشر ملک میری کہانی کا ہیرو بنا' ورنہ ابتدا سے اختتام سے ذرا پہلے تک اس کا عام ہونا جوں کا توں برقرار رہا۔

آپ کو یہ کردار عام لگتا ہے یا خاص' اس کا فیصلہ آپ کریں گے۔

میرا کتابی شکل میں چھپنے والا پہلا ناول آپ کے ہاتھوں میں ہے اور اب یہ آپ کی مرضی ہے کہ آپ کس کردار کی کن صفات میں اپنی پسندیدگی پاتے ہیں۔

فائزہ افتخار لاہور

پھلاں دے رنگ کالے

پچھلے سال چھٹیوں کے بعد وہ جو یادیں لے کے اس گھر سے رخصت ہوئی تھی، وہی سرد رویے اس بار بھی اس کے استقبال کو موجود تھے، کچھ بھی تو نہ بدلا تھا، وہی بی بی جان کی برفیلی تیرے چبھوتی نگاہیں، وہی چچی جان کا دھوپ چھاؤں سا مزاج، وہی تائی امی کا لاتعلق سا رویہ، وہی کزنز کا گریز اور وہی در و دیوار کی اجنبیت، باچا جان کی طبیعت میں بھی اسے کوئی خاص تبدیلی محسوس نہ ہوئی. وہ جب بھی چھٹیوں میں گھر آتی انہیں بستر پہ اسی طرح موت کی آہٹیں سنتے دیکھتی۔ کوئی نہ کوئی نرس ان کی ڈرپ چیک کر رہی ہوتی اور ان کی کوئی نہ کوئی بہو یہ تبصرہ کر رہی ہوتی۔

"باچا جان اس بار بچتے نہیں لگتے، خدا خیر کرے۔" اور خدا برسوں سے خیر کرتا چلا آ رہا تھا۔ باچا جان فالج، ہارٹ اٹیک، کینسر اور شوگر کے ہر ہر حملے کے بعد بچ جاتے تھے اور اگر ان کی طبیعت بہت سنبھلی ہوتی تو زبان سے چند ٹوٹے پھوٹے لفظ بھی ادا کر لیتے اور فالج نے ان کا نچلا دھڑ تو مفلوج کیا ہی تھا، قوتِ گویائی بھی متاثر کی تھی۔ اس بار بھی شاید طبیعت کچھ بہتر تھی جبھی ساری اولاد کے اکٹھا ہونے پر انہوں نے وکیل کو بلوا کر وصیت تیار کروائی تھی۔

وہ عمر کے اس حصے اور صحت کے اس مرحلے پہ تھے کہ ان کا وصیت تیار کرانا کوئی ایسی غیر معمولی بات بھی نہ تھی۔ انہونی تو یہ ہوئی کہ انہوں نے تمام اولاد میں برابر ترکہ تقسیم کرنے کے بعد اولاد کی اولاد میں سے صرف ایک پوتی مقدس زریاب کو امتیازی حیثیت سے اپنے پرسنل اکاؤنٹ اور خاندانی نوادرات و زیورات کا وارث قرار دیا۔

اکاؤنٹ کے بارے میں تو وہی بہتر جانتے ہوں گے، البتہ نوادرات و زیورات کا تخمینہ لاکھوں نہیں کروڑوں میں لگایا جا رہا تھا۔ اگرچہ انہیں بیچنا خاندانی حرمت و وقار کے منافی تھا

urdu.com
Abha
URDU PHOTO

لیکن بڑی بات تو یہ تھی کہ نسلوں سے یہ ترکہ خاندان کے بڑے بیٹے کی ملکیت میں چلا آ رہا تھا۔ یہ ایک غیر تحریری آئین تھا جس کی رُو سے تایا جان افراسیاب خٹک اس کے امین تھے اور باچا جان نے بڑے اور چھوٹے بیٹے کو چھوڑ کر خاندانی عظمت کی یہ نشانیاں اپنی پوتی کو سونپنے کی وصیت کی تھی، ایسی پوتی جس کی حیثیت ہی اس خاندان میں مشکوک سمجھی جاتی تھی۔ نفرت، کراہیت، گریز، لاتعلقی کے وار تو بچپن سے سہتی چلی آ رہی تھی باچا جان کے منجھلے بیٹے زریاب خٹک کی اکلوتی اولاد مقدس، اب عداوت بھی اس کے نصیب میں لکھ دی گئی تھی۔

☆☆☆

"واؤ، کتنی پیاری ہے ناں سانتھا، بالکل سنڈریلا جیسی۔"

فارحہ نے لیٹ ایڈمیشن لینے والی اپنی نئی فرنچ کلاس فیلو کو دیکھ کے کوئی چوتھی بار کہا۔ اس سے قبل وہ اسے دیکھ کے سنو وائٹ اور باربی ڈول کے خطاب بھی دے چکی تھی۔ یہ پشاور کا سب سے مشہور کانونٹ تھا جہاں اکثر ممالک کے سفارت کاروں کے بچے زیر تعلیم تھے۔

"سنڈریلا اتنی موٹی نہیں تھی، تم نے اسٹوری بک میں دیکھا نہیں کیا؟" ریما نے چاکلیٹ سے چپکتے ہاتھ ٹشو سے پونچھتے ہوئے رشک وحسد کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا۔ انگلش، جرمن، فرنچ فیملیز کے بچوں کو ملنے والی توجہ سے وہ اکثر جیلس رہتی۔

"اور کیا، وائٹ کمپلیکشن ہونے سے ہر کوئی سنو وائٹ نہیں ہو جاتا۔ ہماری مقدس سے زیادہ کیوٹ نہیں ہے وہ سانتھا۔" شناور ہمیشہ کی طرح اپنی فیورٹ [illegible] کے گلے میں بانہیں ڈال کے اسے گفتگو میں کھینچ لائی۔

"لیکن وہ فارنر ہے۔" فاریہ اپنے پوائنٹ پہ زور دیتے ہوئے بولی۔

"تو کیا ہوا؟" شناور چبا چبا کے بولی۔ "مقدس کی مدر بھی فارنر تھیں۔"

"رئیلی؟" نوعمر کی بچیوں کا وہ پورا گروپ مارے ایکسائٹمنٹ کے چلا اٹھا۔ [illegible] مقدس حیرت سے گنگ بنی شناور اپنی پھوپی زاد کو تکتی رہی۔ خود اس کی نو سالہ زندگی میں یہ پہلا انکشاف تھا اس کی ماں کے بارے میں۔

"آئی سویئر، میں نے خود سنا ہے۔" وہ مقدس کی طرف پلٹی۔

"یاد ہے جب ہم اسلام آباد بڑے ماموں کے ہاں گل ریز کی برتھ ڈے پارٹی کے لیے گئے تھے، وہاں نتاشا آپی کی اسکول فرینڈز بھی آئی تھیں انہوں نے آپی سے کہا کہ ویسے تو تم سبھی کرنز پریٹی ہو مگر اس لٹل گرل کے فیچرز بہت شارپ ہیں اور لک بھی انگلش ہے تب تانی آپی نے کہا کہ اس کی مدر یعنی ہماری آنٹی فارنر تھیں اور مما کہتی ہیں مقدس ہو بہو اپنی مدر جیسی ہے۔"

اور یہ تھا پہلا تعارف اس کا اپنی ماں سے۔ کتنا عجیب سا لگتا ہے کسی ایسی بچی کے بارے میں یہ سننا، جو آج کے الیکٹرانک دور میں میڈیا کی بدولت اپنی عمر سے دس گنا زیادہ میچور سوچ رکھتی ہو، جو ایک بھرے پرے خوش حال کنبے میں پرورش پا رہی ہو، لیکن نو برس کی عمر میں پہلی بار اس نے اپنی ماں کا ذکر سنا ہو، چاہے اس کی ماں مر ہی کیوں نہ گئی ہو۔

شناور اس کی واحد دوست، جس کے قریب آنے کی واحد وجہ بھی یہی تھی کہ وہ بھی اس کی طرح ماں سے محروم تھی۔ لوریاں سننے کی عمر میں جب شناور اپنی ماں کے بارے میں فرضی قصے گھڑ کے سنایا کرتی کہ کل رات مما پریوں کے سے سنہری پر لگا کے کھڑکی کے راستے میرے کمرے میں آئیں اور مجھے ڈھیر سا پیار کر کے گئیں تو وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگتی۔

شناور کے پاس اس کا باپ تھا جو جب بیٹی سے ملنے آتا اپنی شریکِ حیات کی یادیں تازہ کرتا، نانی تھی جو نواسی کو گود میں بٹھا کے بیٹی کے بچپن کی شرارتیں سناتی اور ہنستے ہنستے رو پڑتی، ماں کی تصویر تھی جو اس کے بستر کے سرہانے پہ ایک دعا کی طرح آویزاں تھی۔ جب کہ اس کے پاس کیا تھا، ماں کی ہلکی سی شبیہ بھی نہیں تھی جس کے سہارے وہ اس کا سراپا تراشتی، نہ ہی باپ کی رفاقت جو اس سے اس کی ماں کی باتیں کرتا، نہ ہی ماں کے حوالے سے کوئی اور قریبی رشتے جو نواسی کے نقوش میں بیٹی کی پرچھائیں تلاشتے۔

اور اگر اس گھر کے مکین اس کی ماں کا نام تک نہیں لیتے، اسے مکمل فراموش کر چکے ہیں تو یہ کچھ ایسی حیرت کی بات نہیں۔ وہ ایک زندہ وجود لیے ہوئے بھی اس عالیشان گھر میں اپنے ہونے کا احساس دلانے میں ناکام ہے تو غیر موجود لوگوں کی بساط ہی کیا۔

مقدس زریاب نے آنکھ کھولتے ہی اپنے اردگرد رشتوں کا ہجوم دیکھا، دل کا نہ سہی مگر خون کے رشتوں کا۔ چچا جان تھے جن کے لیے اس کا ہونا نہ ہونا ایک برابر تھا ویسے بھی وہ اپنی [illegible] کے تحت اپنے کے بچوں تک کے زیادہ قریب نہ تھے، وہ اور ان کی زمینیں، ان کی بڑی بڑی مونچھوں اور لمبی لمبی گن رکھنے والے دوست، تاش اور شکار کی محفلیں، گھر میں وہ کم ہی ٹکتے یا پھر اکثر سوئے ہوئے پائے جاتے۔ ان کی پڑھی لکھی اور گھر کے گھٹے ماحول سے سدا کی بیزار بیگم، چچی جان جو بے حد موڈی سی تھیں، کبھی تو اپنے بچوں کے ہجوم میں اس کا اور شناور کا بے ضرر سا وجود انہیں بے طرح کھٹکتا، بلاوجہ چڑ جاتیں وہ ان دونوں کی موجودگی سے اور خصوصاً اس کے سامنے تو دبا دبا سا اظہار بھی کر دیتیں کہ اس سے زیادہ کھل کر بدتہذیب ہونے کی ان کی تعلیم اجازت نہیں دیتی تھی۔ البتہ شناور کو بی بی جان یعنی اس کی سگی نانی کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس کے سامنے وہ محتاط ہی رہتیں۔ کبھی کبھی محض بی بی جان اور ان کی لاڈلی نواسی کی چڑ میں مقدس پہ خاصی مہربان بھی ہو جاتیں۔ جو بھی تھا بہر حال انہوں

Aahadu.com
Aaha URDU PHOTO

نے محبت و شفقت کے نام پہ نہ سہی، انسانیت اور خدا ترسی کے حوالے سے دونوں لڑکیوں کا مقدور بھر خیال ضرور رکھا۔

باچا جان سدا کے بیمار، اس نے ہوش سنبھالتے ہی انہیں بستر سنبھالتے دیکھا کبھی کبھی تو وہ اس قدر بیمار پڑ جاتے کہ سارا خاندان اِکٹھا ہو جاتا، کئی اہم تقریبات ملتوی ہو جاتیں، کئی ضروری کام التواء میں ڈال دیے جاتے اِس خدشہ کے پیشِ نظر کہ کہیں خدانخواستہ..... لیکن بڑی سے بڑی تکلیف کے بعد باچا جان بھلے چنگے ہو جاتے، ویسے بھلے چنگے کہنا تو غلط ہوگا یوں کہیں موت کو ٹال کے واپس آ جاتے۔ انہیں اپنے کمرے سے نکلے کئی برس بیت چکے تھے۔ بی بی جان تھیں، باچا جان کی دوسری بیوی، انتہائی طرحدار اور حسین خاتون، نہایت کم عمری میں شادی ہو جانے کی وجہ سے یہ پٹھان زادی، دادی اور نانی بننے کے باوجود اڑتیس، چالیس سے اُوپر کی نہ لگتی تھیں۔ جب کہ باچا جان اچھے خاصے ضعیف لگتے، چچی جان کہتیں، بی بی جان اتنی بھی کم عمر نہیں، پچاس کے قریب ہیں۔ بس ویسے ہی عمر نجانے کیوں ان پر ٹھہر سی گئی ہے۔ بالوں کو سفیدی چھو کے گزر گئی، بس چند تار ہی جھلملاتے ہیں ان کے بارعب سر پہ، نیلی بلور آنکھوں میں چنگاریاں پھوٹتیں اور باریک سرخ لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست رہتے جیسے کوئی اہم راز اس قید سے باہر نکلنے کو بے تاب ہو اور اسے جبراً سینے میں دبا دیا گیا ہو۔ مقدس کو سامنے پا کے یہ چنگاریاں کچھ اور بھڑک اُٹھتیں اور لب زیادہ بھنچ جاتے۔ وہ کم ہی اسے مخاطب کرتیں۔ اس کے لیے ان کے رویے میں [illegible] جھلستی ہوئی، یا خشکی ہوتی ہڈیوں میں خوف جماتی ہوئی۔

چچا جان اور مرحومہ پھوپھی بی بی جان کی سگی اولاد تھے۔ پھوپھی شادی کے ایک سال بعد ہی شناور کو جنم دیتے ہی مر گئیں وہ اور شناور تقریباً ہم عمر تھیں۔ جب کہ دراب چچا کی انوشہ اور پلوشہ ان سے ڈیڑھ دو سال چھوٹی تھیں۔ ان جڑواں بہنوں کے بعد ان کے اوپر تین بیٹے تھے۔ اس کے سگے تایا افراسیاب خٹک اور بابا جان دونوں بھائی بی بی جان کی مرحومہ سوکن کے بیٹے تھے۔ جنہوں نے انہیں ماں جیسی ہی عزت دی۔

تایا جان اپنی فیملی کے ساتھ اسلام آباد سیٹل تھے وہ کچھ سیاست وغیرہ کا شغل رکھتے تھے مقدس کے ساتھ ان کا رویہ بھی کچھ مختلف نہ تھا۔ انہوں نے کبھی نظر بھر کے بھی سگے ماں جائے کی اکلوتی اولاد کو نہ دیکھا۔ اس کے سلام کا جواب بھی وہ بے رغبتی سے منہ پھیر کے دیتے اس کے علاوہ اس کی کبھی ہمت نہ ہوئی ان سے بات کرنے کی، اگر کبھی بھولے بھٹکے ان کی نگاہ اس پہ پڑ بھی جاتی تو سرخ و سفید چہرہ دہکنے لگتا۔ بڑی بڑی بادامی آنکھیں لہو رنگ ہو جاتیں اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل جاتے حالانکہ مقدس کو تو انہیں اٹھتے بیٹھتے، بولتے، مسکراتے ہر

طرح سے دیکھتے رہنا بے حد پسند تھا۔ کیونکہ ہمیشہ سے اس نے یہ سنا تھا کہ اس کے بابا جان اور تایا جان میں خاصی مشابہت ہے۔ اگرچہ گھر میں اس نے اپنے باپ کی کئی قد آور تصاویر آویزاں دیکھی تھیں لیکن تایا جان کی صورت وہ انہیں مجسم دیکھ کے دل کو تسکین دے دیتی تھی۔ جب کہ ماں، ماں کے حوالے سے وہ کوئی بھی ذکر سنتی تو تسکین کے بجائے عجیب سی وحشت دل کو گھیر لیتی۔

اُسے یاد تھا ایک بار جب وہ پلوشہ اور شناور تائی آپی کی منگنی کی باتیں کر رہی تھیں۔

''کتنی خوب صورت لگ رہی تھیں آپی۔ میرون شرارے میں اور ان کی لانبی گردن میں وہ گلوبند کتنا جچ رہا تھا۔'' یہ پلوشہ کی رائے تھی۔

''اتنے سیک اپ اور جیولری کے ساتھ تو کوئی بھی خوب صورت لگے گا۔'' شناور کی دلتاشہ آپی کے ساتھ کم ہی بنتی تھی۔

''خیر ایسی بات بھی نہیں۔ وہ ویسے بھی خوب صورت ہیں۔ ہماری پوری فیملی میں صرف انہی کی آنکھیں اور بال بلیک ہیں۔ یہ بھی ان کی انفرادیت ہے۔'' مقدس نے کھلے دل سے تعریف کی۔

''واہ ایسے ہی، باقی کیا کم ہیں۔ ان سے تو تانیہ زیادہ اٹریکٹو ہے۔ میری بھی ہائٹ کچھ کچھ کم ہے، لیکن خیر ابھی میری ایج بھی تو ففٹین ہے، تھوڑی سی ہائٹ اور بڑھ جائے تو تمہاری تائی آپی کیا لگیں گی میرے آگے۔ تم دونوں بھی اچھی لگو گی، بڑی ہو کے بہت اچھی لگو گی دیکھ لینا اور یہ مقدس تو ہے ہی بیوٹی کوئین۔''

[illegible] شناور، مما کہتی ہیں انہوں نے پاپا سے سنا ہے، مقدس کی مما بے حد خوبصورت تھیں، ایسے جیسے کوئی پری، انہوں نے آج تک ایسی حسین عورت نہیں دیکھی، مما کہتی ہیں ایسی تعریف [illegible] ان کا اکثر جی چاہتا ہے کاش انہوں نے بھی تمہاری مما کو دیکھا ہوتا۔

[illegible] تائید پانے کے لیے مقدس کی طرف دیکھا جو بے دھیانی میں سیڑھیاں اُترتی بی بی جان کو دیکھ رہی تھی۔ ہلکے انگوری رنگ کے جارجٹ کے شلوار قمیص چکن کی کریم کلر کی بڑی سی چادر اوڑھے وہ کسی قدر باوقار لگ رہی تھیں۔ سلیقے سے گندھے بالوں پہ باریک شفون کا دوپٹہ تھا۔ کانوں سے لٹکی بالیوں کے ساتھ موتیے کی تازہ اَدھ کھلی کلیاں اٹکی تھیں۔

ان کی نگاہ اب تک مقدس پہ نہیں پڑی تھی، اس لیے چہرے کے نقوش بگاڑتے ہوئے تلخ تاثرات ناپید تھے۔ اس سے نجانے وہ کیوں اسے بہت اچھی لگیں، شاید اس لیے کہ اس نے کبھی کبھار ہی انہیں نفرت اور بے زاری کے بغیر دیکھا تھا، اسی لیے بے ساختہ کہہ اُٹھی۔

''بی بی جان بھی تو کوئی پری ہی لگتی ہیں، اب بھی اتنی حسین ہیں تو پہلے کیا لگتی ہوں گی ہے ناں؟''

Urdu Photo

"دیکھیے بی بی جان، مقدس کیا کہہ رہی ہے۔" شناور، سدا کی منہ پھٹ اور جذباتی، چلا اُٹھی۔ اس کا مقصد محض بی بی جان کے دل میں کسی طرح اپنی دوست کے لیے جگہ پیدا کرنا تھی۔ وہ ان کے گریز اور سرد مہری کو ہمیشہ سوتیلے پن کی رعایت دیتی تھی۔ مقدس نے اس کا ہاتھ دبا کے مزید کچھ کہنے سے باز رکھنے کی کوشش کی، مگر تب تک وہ بی بی جان کو سیڑھیاں نیچے اُتر کر آنے کی مہلت دیے بغیر شروع ہو چکی تھیں۔

"مقدس کو آپ اتنی پسند ہیں مجھے تو پتہ ہی نہ تھا۔ میں تو سمجھتی تھی آپ کو سب سے زیادہ پیار میں کرتی ہوں، لیکن یہ کہہ رہی تھی کہ بی بی جان اتنی خوب صورت ہیں اتنی خوب صورت ہیں کہ جتنی اس کی اپنی مما۔ اس کے لیے دونوں ہی....."

بی بی جان کو طیش میں تیزی سے آگے بڑھتے دیکھ کے اس کی زبان گنگ ہو گئی اور مقدس کسی انجانے جرم کے احساس سے سہمی، لرزتی ٹانگوں پہ کھڑی ہو گئی۔

"چٹاخ....." اگر محض جسمانی تکلیف کو ہی تشدد کا نام دیا جاتا ہے تو بے شک اس کی پندرہ سالہ زندگی کا یہ پہلا تھپڑ تھا جو اسے ماں کے حوالے سے ملا تھا۔

"تیری اتنی جرات، تو میرا مقابلہ اپنی ماں سے کرے گی۔ ارے میں اصل خاندان کی، عزت دار الحمدللہ پکی مسلمان، ساری عمر اپنے وقار کو سینت سینت کر رکھتے گزر گئی۔ اور یہ..... یہ اس حرافہ کی نشانی، مجھے پل بھر میں دو کوڑی کا کر گئی۔ میرا نام اس ہندنی کے ساتھ لے کر۔ وہ کافر کی اولاد اور میں اس بدبخت کی نظر میں ایک جیسی ہستی۔ کہاں دیکھ لی تو نے اس ہندنی (ہندو عورت) کی کالی صورت، جو میرے ساتھ مقابلہ کرنے چلی ہے۔ کس نے پھونک دیا تیرے کانوں میں اس کے حسن کے بارے میں۔

میں بتاتی ہوں تجھے اس کے کالے کرتوت، خود تو کہیں منہ کالا کر رہی ہو گی میرے بیٹے کو ذلت سے دو چار کر کے در بدر کر دیا۔ میرا خان برسوں سے اس کے انتظار میں ہے نہ رہا ہے نہ مر رہا ہے۔"

توہین کے احساس سے بپھری بی بی جان اس پہ وحشیوں کی مانند پل پڑی تھیں اور پھر باجا جان کی حالت پر اُونچی اُونچی آواز میں روتے ہوئے نڈھال ہو کے ایک جانب پڑ گئیں۔ پورا گھر حیرت کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہا تھا، اس کے گھر کے در و دیوار نے بھی شاید کسی خان زادی کی اتنی بلند آواز اور کوسنے پہلی بار سنے تھے، یوں لگتا تھا جیسے افراد کے ساتھ ساتھ دیواریں بھی سکتے میں آ گئی ہوں اور وہ..... گھٹنوں کے بل زمین پہ بیٹھی، نچے ہوئے بال، ادھڑی آستین، سوجے رخساروں اور ہونٹوں سے نکلتے خون سے بے خبر بی بی جان کا ایک ایک لفظ دہرا رہی تھی۔ پہلی بار اس نے ان کے منہ سے اپنی ماں کا ذکر سنا تھا

اور وہ بھی اس قدر تفصیل سے، اتنے بھیانک انکشافات کے ساتھ۔ وہ بدن پہ لگی چوٹوں اور ملازموں تک کے سامنے ملنے والی اس ذلت سے بے پرواہ، بس یہ سوچ رہی تھی کہ چلو یہ راز تو کھلا میں یتیم نہیں ہوں، ورنہ زندگی کے کتنے برس اس الجھن کی کھوج میں بیت گئے کہ میری ماں زندہ ہے یا مر گئی یا اس کو طلاق مل گئی، میرا باپ اس دنیا میں کہیں ہے یا..... وہ دونوں اس دنیا کے کسی نہ کسی کونے میں موجود ہیں۔ اپنے کھوکھلے تعلق کی ایک بدنما یادگار سے یکسر بے خبر، بالکل انجان۔

اور اسی رات اس کے نیل پڑی چوٹوں پہ گرم نمک کرتے ہوئے شناور منت کر رہی تھی۔

"مقدس، تو انسان ہے یا پتھر، روتی کیوں نہیں، رو، خدا کے لیے رو لو تھوڑا سا۔"

"شانو، کیا میری ماں ہندو تھی..... اور کیا اس کی وجہ سے میں کافر کی اولاد کہلاؤں گی؟" وہ بولی بھی تو صرف یہ۔

"دیکھو پہلی بات تو یہ کہ تم ماموں زریاب کی اولاد ہو اور مسلمان ہی کہلاؤ گی۔ اور دوسری یہ کہ میں نہیں مانتی تمہاری مما ہندو تھیں۔ شاید وہ عیسائی ہوں یا پھر یہودی۔ اتنا تو میں جانتی ہوں کہ اہلِ کتاب سے مسلمان مرد کا نکاح جائز ہے۔ تو پھر ضرور مسلمان ہونے کے بعد ہی وہ اس گھر میں آئی ہوں گی، اگر بی بی جان کے کہنے کے مطابق وہ کافر تھیں ظاہر ہے کسی ہندو سے تو نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔"

"تو پھر..... پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے بابا جان نے ان سے..... نک..... میرا مطلب ہے نکاح ہوا ہی نہ ہو۔" اس نے کہنے کے ساتھ ہی خود اپنے لب دانتوں سے کاٹ لیے گویا یہ بات تصور کرنا بھی کتنا اذیت ناک تھا اس کے لیے۔

"مقدس..... اپنے خاندان کی روایات کو جانتی ہو تم اور یہ بھی کہ کس طرح ان کی پاسداری کی جاتی ہے۔ سب جانتے ہیں تمہاری مما ایک ڈیڑھ سال تک یہاں، اس گھر میں اس حیثیت فیملی میں بہو کی حیثیت سے رہی ہیں کیا ہمارے گھر کے مرد اتنی جرات کر سکتے ہیں کہ بغیر کسی نکاح کے، کسی عورت کو یہاں لا کے رکھ سکیں۔ ارے ہم لوگوں کے دادا، پردادا نے چھ چھ سات سات نکاح کر رکھے تھے لیکن ایسی حرکت..... توبہ توبہ ایسا تو سوچو بھی مت۔" وہ اس عمر میں بھی خاندانی روایات سے بخوبی آگاہ تھی۔

"تو اگر میری مما مسلمان ہو چکی تھیں تو ان کے پچھلے حوالے کو کیوں یاد رکھا گیا ہے۔ کیوں انہیں ہندنی، کافر کی اولاد جیسے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔" وہ احتجاجاً بلک اُٹھی۔

"اس لیے کیونکہ....." وہ اسے مطمئن کرنے کے لیے کچھ جواز سوچ رہی تھی کہ چچی جان گرم دودھ کا گلاس لے کے اندر داخل ہوئیں اور اس کی مشکل آسان کی۔

Urdu.com
URDU PHOTO

"اس لیے بیٹا، کیونکہ انہوں نے اپنا پچھلا حوالہ کسی کو بھولنے نہیں دیا۔ وہ اس خاندان میں رچ بس جاتیں یہاں کے قاعدے اصول اور روایات اپنا لیتیں تو آج شاید کوئی جان بھی نہ پاتا کہ خان زریاب خٹک کی بیوی کہاں سے آئی تھی۔ لیکن شاید وہ آزاد فضاؤں کی باسی چادر اور چار دیواری کی پابندی برداشت نہیں کر پائی۔ کون جانے اب تک وہ مسلمان رہی بھی ہے یا نہیں۔

تمہارے چچا ان دنوں ہارورڈ یونیورسٹی میں تھے انہیں تمہارے بابا جان نے تصاویر بھیجی تھیں، وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ صحیح طرح نہیں جانتے وہ جرمن تھیں یا انگریز یا فرنچ۔ اپنی شادی کے وقت جب یہاں آئے تو انہیں خبر ہوئی کہ بھائی کی گرہستی اُجڑے کئی ماہ ہو چکے ہیں۔ بی بی جان نے کبھی تفصیل کسی کو نہیں بتائی۔ لیکن مشہور یہی ہے کہ وہ تمہارے بابا کے ساتھ نبھا نہ سکیں، نہ ہی مشرقی طور اطوار کے تقاضے پورے کر سکیں، شوہر کی غیر موجودگی میں کسی اور کے ساتھ دوستی پیدا کر لی تھی انہوں نے، لالہ زریاب نے انہیں تو غیرت میں آ کے فوراً گھر سے نکال دیا لیکن خود بھی جگ ہنسائی کے خوف سے [illegible] روپوش ہو گئے۔ خاندان کی ناموس پہ لگا یہ زخم ہمارے بزرگ بھلا نہیں پائے۔"

"لیکن اس سارے قصے میں میرا قصور کہاں نکلتا ہے۔ میرے ساتھ سب کا رویہ نارمل کیوں نہیں۔" وہ سراپا سوال تھی۔

"میں پھر وہی بات کہوں گی کہ اس بار تمہارے بابا نے یہ سب کسی کو بھولنے نہ دیا۔ وہ خود اگر اس سانحے کو فراموش کر دیتے، تمہارے ساتھ سایہ بن کے رہتے، اپنا گھر بسا لیتے تو لوگ بھی کب کے بھول بھال چکے ہوتے۔ ان کی خود ساختہ جلاوطنی اس زخم پہ کھرنڈ نہیں آنے دیتی۔ ہر زخم کو مرہم چاہیے۔ جن زخموں کا منہ کھلا رہ جائے وہ ٹیس تو دیتے ہی ہیں۔ تمہارا وجود باچا جان اور بڑے لالہ کو لالہ زریاب کی یاد دلاتا رہے گا۔ [illegible] ہیں اور کب آئیں گے۔ حیرت کی بات ہے دونوں بھائیوں نے ان کو ڈھونڈنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ مگر انہیں یقین ہے وہ ضرور ایک دن لوٹیں گے، چودہ سال سے اوپر ہو رہے ہیں مجھے اس گھر میں آئے، میں نے آج تک ان کا کوئی خط، کوئی پیغام، کوئی اطلاع آتے نہیں دیکھی۔ ایک بار تمہارے چچا سے کہا تھا کہ بڑے لالہ اتنے اثر و رسوخ والے ہیں وہ کیوں نہیں کوشش کرتے بھائی کو کھوجنے کی، تو کہنے لگے اس کی ضرورت نہیں، وہ لوٹ آئیں گے بلکہ لوٹنے ہی والے ہیں۔ اللہ کرے ان کا یقین سچ ہی ثابت ہو، اگر ایسا ہو جائے تو تمہارا امتحان بھی ختم ہو جائے گا۔ کون جانے کہ خون کی کشش انہیں کب کھینچ کے لے آئے۔" انہوں نے بات مکمل کرتے ہوئے دودھ کا گلاس اس کے لبوں سے لگایا۔

"جی نہیں کرتا چچی جان۔" اس نے ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے ٹوٹے لہجے میں کہا۔

"یہ پکڑو شانو، اسے پلاؤ اور یہ سمجھاؤ کہ جن کے لیے اس کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے اور جو اسے دنیا میں لانے کی وجہ بننے کے باوجود اسے بھلائے بیٹھے ہیں ان کی خاطر کیوں خود کو ہلکان کرتی ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے، میں اتنی تھی تو گھر میں کیا ہوا، کیسے ہوا کی خبر ہی نہ ہوتی تھی، اسے اس کی کم عمری کے باوجود میں نے وہ تمام تلخ باتیں اور انکشافات بتا دیے، جتنے کہ میں جانتی تھی صرف اس لیے کہ اس کے اندر کے کچھ سوال تو خاموش ہوں۔ جو ہے اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ اپنی زندگی کی قدر کرو۔ اسے جیو اپنی پہچان خود بناؤ۔"

اسے لاہور بھیج دیا گیا۔ کنیئرڈ کالج میں فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے جب وہ پہلی بار داخل ہوئی تو اتنی پُراعتماد ہرگز نہیں تھی جتنے گزرے دنوں نے اسے بنا دیا تھا۔ یہاں کوئی اس پہ، اس کی ذات پہ کیچڑ اچھالنے والا نہیں تھا۔ یکسوئی اور ذہنی سکون نے اسے پڑھائی کی جانب راغب کر دیا، ساتھ ہی مخفی صلاحیتیں کھل کے نکھر کے سامنے آ گئیں۔ اب وہ کالج کی ہونہار طالبہ تھی۔ ایف ایس سی میں ٹاپ کر لینے کے بعد اس نے میڈیکل لائن کو چنا اور کنگ ایڈورڈ میں چلی آئی۔

یہ ڈھائی سال اس نے محض اپنی ذات کی ہمراہی میں گزارے۔ نہ خود کبھی ماں، باپ کے بارے میں سوچنے کی ضرورت محسوس کی اور نہ ہی کسی کو اپنے اتنے قریب آنے دیا کہ وہ اس کے سوئے درد جگاتا۔

[illegible] شانو اور [illegible] ایف اے کرنے کے بعد اس کے پیچھے پیچھے لاہور چلی آئی۔ اس نے یہ عرصہ [illegible] کے اس کے بغیر گزارا تھا۔ بی بی جان تو کبھی اسے نہ بھیجتیں مگر اس [illegible] اپنے بابا رحیم گل آفریدی کے آگے پیش کیا جو اکثر و بیشتر اس سے ملنے آتے رہتے تھے۔ اگرچہ پھوپھو کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہی انہوں نے دوسری شادی کر لی تھی لیکن وہ اس گھر سے اپنا رشتہ ختم نہیں کر سکے تھے۔ کیونکہ بی بی جان کے وہ محض داماد ہی نہیں، سگے بھانجے بھی تھے۔ اس کے علاوہ ان کے والد اور باچا جان چچا زاد بھی تھے۔ یوں وہ بلا تکلف آتے جاتے رہتے۔ اس بار مقدس بھی وہیں تھی۔

"بابا جانی پلیز بی بی جان کو سمجھائیے ناں، یہاں پورے سرحد میں کوئی آرٹ اسکول نہیں ہے۔ میں فائن آرٹس میں ماسٹرز کرنا چاہتی ہوں۔ اگر مجھے این سی اے میں ایڈمیشن نہ دلایا گیا تو مزید آگے ہرگز نہیں پڑھوں گی۔"

urdu photo

یہ دھمکی بی بی جان کو بھی کچھ سوچنے پہ مجبور کر گئی۔ اس کی بات بہت پہلے سے افراسیاب خان کے بڑے بیٹے گل ریز خان خٹک سے طے تھی جو لندن میں اعلیٰ تعلیم کی منازل طے کر رہا تھا۔ جب کہ شانو کو سرے سے پڑھائی کی طرف دلچسپی ہی نہ تھی۔ وہ جانتی تھیں زمانہ بدل رہا ہے، بچے اپنے بزرگوں کے فیصلوں میں نقص نکالنے کو تیار رہتے ہیں، کہیں تعلیم کی کمی اس رشتے کے ختم ہونے کا جواز نہ بن جائے۔ شاید اپنی مرضی کی تعلیم اسے پڑھنے لکھنے کی جانب راغب کر ہی دے۔

"چلو کم از کم کوئی تو وارث ٹھہرے گا تمہارے ماموں کے رنگوں سے کھیلنے کے شوق کا۔" وہ مسکرا کے بولے۔

"ماموں؟ کون سے ماموں۔ چھوٹے ماموں تو ہرگز اس طرف مائل نہیں ہو سکتے تو کیا بڑے ماموں مصوری کا شوق رکھتے تھے؟"

"نہیں وہ تمہارے منجھلے ماموں، خان ذریاب خٹک، وہ دیوانہ تھا تصویروں کا، رنگوں کا، حسن کا۔" وہ نجانے کیوں اداس ہو گئے آخر تین لڑکیں ایک ساتھ گزارا تھا۔ شناور ان کے بارے میں اور بھی کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن بی بی جان کے سہمے چہرے اور بابا کے شکستہ تیور دیکھ کر الجھ سی گئی۔ ماحول پہ ایک بوجھل پن سا طاری تھا۔ مقدس عرصے بعد اُبھرتے تجسس کے احساس سے گھبرا گئی۔ وہ پھر سے اس کیا، کیوں، کب اور کیسے کے جال میں پھنسنا نہیں چاہتی تھی۔ بہت مشکل سے اپنے منتشر ذہن کو ایک مقصد کی طرف مائل کیا تھا اس نے کچھ بن جانے کا، اپنی شناخت خود بنانے کا۔

شناور کے لاہور آ جانے سے بھی اس کی یکسوئی میں خلل پڑا۔ وہ اکثر انجانے میں اس کے خوابیدہ تجسس کو جگا دیتی۔ ایک دن تو بھد ہو گئی۔

"تم چلو تو ایک بار میرے ہاسٹل، دیکھو تو سہی میں غلط نہیں کہہ رہی۔"

"میں نے کب کہا تم غلط کہہ رہی ہو۔ ہو جاتی ہے اکثر ایسی مشابہت، لیکن میں کیا کروں گی اس عورت سے مل کے۔"

"قسم سے میں تو اسے دیکھ کے حیران ہی رہ گئی، ہو بہو تمہاری آنکھیں، یہی ناک، چہرے کا نچلا حصہ جلا ہوا ہے اس کا، ورنہ کیا پتا تم دونوں ہم شکل ہی کہلاتیں۔ بلکہ سچ پوچھو تو ایک بار میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ کہیں یہ تمہاری مما ہی نہ ہوں۔ لیکن خیر اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ پٹھان ہی ہے بالکل دیہاتی قسم کی، کسی پہاڑی علاقے کی لگتی ہے۔ ماتھے اور رُخسار پہ تل گودے ہوئے ہیں، یہ لمبا گھونگھٹ نکالتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی بغیر کسی تعلق اور رشتے کے بھی کس درجہ مشابہت پائی جاتی ہے دو انسانوں میں، تم ایک بار اگر دیکھ....."

"لیکن میں کیوں دیکھوں۔ میں نے اپنی آنکھیں ہزار بار دیکھی ہیں، یہ چہرہ دن میں کئی بار آئینے میں دیکھتی ہوں، پھر ایسی ہی آنکھیں، ایسی ہی ناک دیکھنے کے لیے فضول وقت کیوں ضائع کروں۔ خدا کے لیے شانو اب بڑی ہو جاؤ، ایسی ایسی باتیں کرتی ہو کہ خدا کی پناہ، ایک پہاڑی دیہاتی عورت سے خوامخواہ مجھے جوڑنے کی کوشش کر رہی ہو محض اس بناء پہ کہ ہماری آنکھوں کا رنگ ایک ہے۔" وہ بیزاری سے بولی۔

"مجھے تو حیرت اس بات پہ ہوئی کہ پورے خاندان میں کسی سے تمہارے نقش نہیں ملتے، جب کہ ایک بالکل انجان عورت، ہمارے ہاسٹل کے کچن میں کام کرنے والی....."

"پلیز شناور جسٹ اسٹاپ اٹ۔ ایک بات کے پیچھے مت پڑ جایا کرو۔" اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے تو وہ چپ ہوئی۔

"بی بی جان سے بڑی لمبی بحث کے بعد میں نے ذریاب ماموں کے اسٹوڈیو کی چابی حاصل کی ہے۔ چلو اُٹھو چلتے ہیں۔"

"کیا؟ بابا کے اسٹوڈیو کی چابی؟ مگر بی بی جان تو ان کے دونوں کمرے لاکر رکھتی ہیں۔ ان کو جانے کی اجازت نہیں، پھر تمہیں کیوں جانے دے رہی ہیں۔" وہ حیرت سے بولی۔

"[illegible] مشکل سے سمجھ پائی انہیں [illegible] کے لیے مجھے پالٹر فرینس اور [illegible] آنا چاہیے اس کے لیے ماموں جان کی کچھ پینٹنگ [illegible] دیکھنا چاہتی ہوں تاکہ کچھ انسپائریشن مل سکے۔"

[illegible] وہ میگزین لے کے نیم دراز ہو گئی۔ [illegible] میلان بھری "اجازت [illegible]

[illegible] کیا تکلیف ہے [illegible] کیوں نہیں آ سکتیں میرے ساتھ؟"

[illegible] جان، میں چھٹیوں کے چند دن یہاں گزارنے آئی ہوں۔ مجھے سکون سے رہنے دو۔ میں نہیں چاہتی میرے کسی بھی عمل سے بی بی جان کو میرا سال میں چند دن یہاں گزارنا بھی دوبھر لگے، تم جانتی ہو میری لاکھ احتیاط کے باوجود کبھی کبھی میری کوئی بات ان کا پارہ چڑھا دیتی ہے۔ اس کمرے میں جانے کی اجازت صرف تمہیں ملی ہے

"کیوں تمہارے پاس کیا یہ جواز کم ہے کہ وہ تمہارے بابا جان کا کمرہ ہے۔ عجیب بے حس لڑکی ہو تم۔ وہ میرے ماموں ہیں جنہیں میں نے کبھی دیکھا تک نہیں، لیکن آج پہلی بار ان کے کمرے میں جاتے ہوئے میں اس قدر ایکسائٹڈ ہوں۔ تم ان کی بیٹی ہو کیا تمہارا دل نہیں چاہتا تم اس کمرے میں جاؤ جہاں انہوں نے پہر بتائے ہوں گے، ان چیزوں کو چھوؤ جو کبھی ان کے استعمال میں رہیں۔ ان کی تخلیقات دیکھو۔" اس نے اُکسایا تو مقدس اداسی

urdu.com
Urdu Photo

سے مسکرادی۔

"میں بھی ان ہی کی ایک چیز ہوں جسے کبھی نہ کبھی تو انہوں نے چھوا ہی ہوگا۔ میں بھی ان ہی کی ایک تخلیق ہوں جسے دیکھنے کو ان کا کبھی جی نہ چاہا۔"

اور واقعی ایک روز پہلے تک اس کے دل میں کوئی خواہش نہ تھی اپنی ہستی کے سربستہ رازوں سے واقف ہونے کی۔ لیکن باچا جان کی وصیت نے تو گویا ایک دھماکا کر دیا۔ ہر ایک انگشت بدنداں تھا۔ ہر فرد خصوصاً تایا جان اور چچا جان اسے قہر آلود نگاہوں سے گھورتے گزر رہے تھے۔ چچی جان نے اسے بی بی جان کے قہر سے بچانے کے لیے کمرے میں بند کر دیا تھا۔ لیکن بی بی جان کی غضب ناک آوازیں اور تائی جان کے بلند کوسنے اسے دیواریں چیر کے دھمکا رہے تھے۔ ایک عرصہ ہوا اس نے اپنی ذات اس گھر کے مکینوں سے اس قدر الگ تھلگ کر لی تھی کہ ان کے کسی قسم کے رویے کی دھوپ اس تک نہ پہنچ پاتی تھی۔

آج برسوں بعد وہ پھر زیر عتاب تھی اور اس بار کڑی کچھ زیادہ ہی تھی کیونکہ پہلے ان کا ہدف اس کی ماں کا مشتبہ حوالہ تھا۔ خاندان کو اس کے ماں باپ کی طرف سے [illegible] خیانت کا غم و غصہ تھا اور اب کی بار وہ خود انہیں مشتعل کرنے کا باعث بنی تھی۔ اس کی [illegible] اس کی بے مول و بے وقعت ہستی کی خاطر باچا جان نے صدیوں پرانی روایت توڑ ڈالی تھی۔ معتبر بیٹوں کے ہوتے ہوئے اسے خاندانی ورثہ کا امین قرار دیا تھا۔ وہ خود نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ ان کے اس فیصلے کے پیچھے کیا مقصد رہا ہوگا۔ ترس، ہمدردی، ازالہ یا آخری وقت میں کی گئی کوئی نیکی سمجھ کے وہ اپنی اس نظر انداز کی جانے والی پوتی کو خاندان [illegible] بنانے جا رہے ہیں۔

"لیکن ان کے اس عمل میں میری کون سی بھلائی ہو سکتی ہے۔" وہ سوچتی رہی۔

"یہ لوگ، میرے سرپرست جو تمام تر کدورت کے باوجود میرے نگران کہلاتے ہیں، میری تعلیم، رہائش اور تمام اخراجات برداشت کرتے ہیں، ان ہی لوگوں سے میری دشمنی [illegible] کر دینے میں میری کیا بھلائی ہو سکتی ہے۔ کیا تایا جان کبھی معاف کر پائیں گے [illegible] کیا ان کی اولاد بھول پائے گی اس بات کو کہ میں ان کا حق انجانے میں ہی سہی مگر ہڑپ کر گئی۔ کیا بی بی جان کو گوارا ہوگا وہ بالشت بھر کی لڑکی، جسے مخاطب کرنا بھی وہ اپنی توہین سمجھتی ہیں، ان کے گھر اتنا اونچا رتبہ حاصل کر بیٹھے گی۔

باچا جان تو ظلم کر رہے ہیں میرے ساتھ میں پہلے ہی بے سہارا ہوں، وہ مجھے دشمنوں کے نرغے میں دیے جا رہے ہیں۔ مجھے ان سے بات کرنا ہوگی۔ انہیں اپنا فیصلہ واپس لینے پہ مجبور کرنا ہوگا۔ اگر انہوں نے میری دلجوئی کی خاطر یا یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ اپنے منجھلے بیٹے کی غیر موجودگی میں بھی اسے کتنا اہم جانتے ہیں، یہ اقدام کیا ہے تو میں یہ تسلیم کر لوں گی

کہ ہاں باچا جان، آپ نے انصاف سے کام لیا۔ آج بیس سال بعد میں آپ کو نظر آ ہی گئی۔ لیکن بس..... بس اتنا ہی..... اتنا ہی کافی ہے کہ..... میں آپ کی نظر میں آ گئی۔

بس..... مگر مجھے دوسروں کی نگاہ میں تو غاصب مت ٹھہرایئے میں جھلسی ہوئی ہوں، تپتے مزاجوں کی مار سے، انجانے جرموں کی سزا بھگت رہی ہوں، بیس برس سے۔ اب تک مما کی بے وفائی اور بابا کی بے اعتنائی کی سزائیں جھیلتی آ رہی ہوں۔ اب آپ کی ہمدردی کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔ آپ کی یہ مہربانی بہت مہنگی پڑے گی مجھے باچا جان، جو خاندان میری ماں کا ایک غیر قوم سے ہونا گناہ عظیم قرار دے کے مجھے اپنی مکمل شناخت دینے سے انکاری ہو جب کہ میری رگوں میں بھی وہی خون دوڑ رہا ہے جو ان کے لیے باعث افتخار ہے چاہے مجھے جنم اک ایسی عورت نے ہی کیوں نہ دیا ہو جو ان کے لیے باعث شرم ہے۔

یہ لوگ مجھے اپنی اولاد کے برابر کھڑا کرنا پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ ماں اور باپ دونوں کی طرف سے اصل نسل ہیں، جب کہ میرے خون میں ملاوٹ ہے ان کی نظر میں، تو پھر اپنی اولاد سے اوپر کیسے دیکھ سکیں گے مجھے، مجھے کہیں جائے پناہ نہیں ملے گی۔

اس نے فیصلہ کر لیا لیکن اس فیصلے پر عمل کرنے کی ہمت پیدا کرنے میں وہ قطعی ناکام ثابت ہوئی اس کا اندازہ اسے اسی رات ہو گیا جب باچا جان کے کمرے میں اسے کاغذات پہ دستخط کرانے کے لیے طلب کیا گیا۔

اونچی چھتوں والے بڑے سے کمرے میں پہلا قدم دھرتے ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی اور یہ سرد لہر اس قدر ظالم تھی کہ اس کا لمس پاتے ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی نے اس کے وجود کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔

باچا جان کا استخوانی وجود اپنی بچی کھچی دشوار سانسوں کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ وکیل [illegible] سے اس کو بدم فق ہوتی لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔ چچا جان نے جیسے شکار کی چال [illegible] ہوئی تھی ان کی نگاہیں مقدس کا نشانہ لے رہی تھیں اور تایا جان اسے راستے سے ہٹانے کے لیے شاید کوئی سیاسی چال چلنے کا سوچ رہے تھے اور..... اور..... بی بی جان..... ان پر ایک ڈری ڈری سی نظر ڈالنے کے بعد تو اس کی ہمت نے دل کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ کس حوصلے اور جرات سے اس نے یہ ہمت مجتمع کی اور دل کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دیا تھا، لیکن اب وہی ہمت ہاتھ چھڑا کے دل سے ایک ایک سیڑھی پھسلتی جا رہی تھی۔

دھڑام.....

اس کے گھٹنے بے جان ہو کے مڑ گئے، وہ فرش پہ گرنے ہی والی تھی کہ نرس نے آگے بڑھ کے اسے سنبھالا، باچا جان کے بستر کی قریبی کرسی پہ بٹھاتے ہوئے ایک ہمدردی بھری

urdu.com
URDU PHOTO

نظر اس کے ٹھنڈے ٹھار نیلے ہوتے چہرے پہ ڈالی اور پھر تاسف سے سر ہلاتی باہر چلی گئی۔ وہ انجان، بے گانی ملازمہ شاید اس سارے قصے سے اس کی نسبت زیادہ واقف تھی۔ اسے اپنی کم آگاہی پہ اور بے بسی محسوس ہونے لگی۔

"لو بیٹا، یہاں سائن کر دو۔" وکیل صاحب نے قلم اور کاغذ اس کے آگے کیا۔

"یہ تحریری ثبوت ہوگا اس بات کا کہ ایک عاقل و بالغ آزاد فرد کی حیثیت سے تمہیں اپنے دادا کی اس وصیت پہ کوئی اعتراض نہیں جس کی رُو سے تمہیں اس خاندان میں صدیوں سے چلے آرہے قیمتی نوادرات، زیورات اور اپنے آباؤ اجداد کی دیگر نشانیوں کا وارث ٹھہرایا گیا ہے۔ تم ان کی حفاظت خلوصِ نیت سے کرنے کی پابند ہوگی، نیز تمہیں اس کی خرید و فروخت کرنے یا کسی غیر خاندان کے فرد کو انہیں تحفتاً یا قیمتاً دینے کی ممانعت ہے۔"

"ایک منٹ وکیل صاحب" تایا جان بے چینی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"باچا جان ایک بار اور سوچ لیجیے، آپ جذباتی ہو کے فیصلہ کر رہے ہیں۔" لیکن باچا جان نے اَن سُنی کرتے ہوئے اپنا نیلی اُبھری ہوئی، زخمی رگوں والا ہاتھ آگے بڑھا کے وکیل کو کارروائی جاری رکھنے کا حکم دیا۔ اس کا گود میں دھرا کپکپاتا ہاتھ جب آگے نہ بڑھا تو وکیل صاحب نے کاغذ اس کے سامنے دھرا اور قلم مزید آگے کر کے اسے تھمانے کی کوشش کی۔ قلم اس کی انگلیوں سے مس ہوا تو ان کی کپکپاہٹ بھی منجمد ہوگئی اور اس کا بھاری ہوتا سر سائیں سائیں کرتا ہوا بے جان سا ہو کے اس کی گود میں آ گرا۔

"او خدا، یہ بے ہوش ہو چکی ہے۔ نرس، نرس۔" وکیل صاحب نے ایمرجنسی بیل دبیے کے ساتھ ساتھ آوازیں بھی دیں۔

باچا جان سر اُٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے دیکھنے لگے۔ نرس نے آگے بڑھ کے بلڈ پریشر چیک کیا۔

"او، بی پی بہت لو ہے۔ سرہائی بلڈ پریشر کے مریض ہیں میرے پاس اس وقت لو بی پی کی کوئی میڈیسن نہیں میں ٹیبلیٹ لکھ دیتی ہوں آپ منگوا دیجیے" ان کے ہوش میں آنے پہ دے دوں گی۔" وہ ہاتھ پیر سہلاتے ہوئے بولی۔

"یہاں..... اسے..... او..... ادھر لاؤ" باچا جان ہمت کر کے بولے۔ اس نے فوراً ہی اسے کرسی سے بیڈ پہ ان کے پہلو میں منتقل کر دیا۔

"سر میں ان کے لیے جوس بنواتی ہوں۔" وہ باہر نکل گئی تو وکیل صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"خان صاحب مجھے اجازت دیجیے۔ میرا خیال ہے اس وقت یہ کام نہیں ہو سکتا۔ آپ

پھر مجھے طلب کر لیجیے گا خدا حافظ۔

☆☆☆

نیم بے ہوشی کے عالم میں اس نے خود کو چند قد آور گہرے سایوں کے نرغے میں پایا۔ وہ اپنی برف میں لگی انگلیاں تڑخ تڑخ کی آواز کے ساتھ کھولتے ہوئے قدموں میں پڑا قلم اٹھانا چاہتی ہے، لیکن ہر بار اس کا ہاتھ قلم کو چھونے سے پہلے ہی کوئی ٹھوکر مار کے اسے چند قدم اور دور کر دیتا ہے۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے چاہے تو بی بی جان نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کے منہ پہ جما دیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بے بسی کے ساتھ ہاتھ پیر ہلاتی رہی اور تایا جان، چچا جان اور بی بی جان اس کے سامنے ہی اس کے ایک ہم شکل وجود کے پرخچے اڑا رہے تھے۔ یہ وجود جو خود اس کا تھا۔

"مگر میں..... میں تو..... بی بی جان نے میرے لبوں پہ ہتھیلی جما رکھی ہے اور..... میں خود ہی اپنے آپ کو کیسے بکھرتے دیکھ رہی ہوں۔"

یہ خیال اس کے بے ہوشی میں ڈوبتے وجود کو ہاتھ تھام کے ہوش کی سرحد پہ کھینچ لایا اور اس کے کانوں میں آتی آوازیں اسے یاد دلانے لگیں کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔

"آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں باچا جان۔"

تایا جان کی آواز میں برہمی تھی، غصہ تھا اور جھنجھلاہٹ تھی۔ وہ اتنا اثر و رسوخ، رعب و دبدبہ رکھتے ہوئے بھی اس نحیف وجود کے سامنے بے بس تھے۔ ان کا ادب، ان کا لحاظ بہت کچھ سہنے پہ مجبور کر رہا تھا۔

"ہمارا خاندان سرحد کے چند ممتاز اور قابلِ احترام خاندانوں میں شمار ہوتا ہے اور ایک زمانہ مجھے خان صاحب کے بڑے بیٹے کی حیثیت سے جانتا ہے، یہ حقیقت بھی سب پہ عیاں ہے کہ ہمارے ہاں باپ اپنے بڑے بیٹے کو خاندانی پشت در پشت چلے آرہے قیمتی ورثے کی جانشینی کا اعلان کرتا ہے۔ جب کہ آپ کا یہ قدم میری حیثیت مشکوک کر دے گا۔"

"تمہاری..... حیثیت پر..... کک..... کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" باچا جان نے اطمینان دلانا چاہا۔

"کیسے نہیں پڑے گا۔ بلکہ میری سیاسی پوزیشن بھی خطرے میں پڑ جائے گی، آپ کا حوالہ میرے لیے محترم سہی مگر میں نے خود اپنی شناخت ایک لمبی جدوجہد کے بعد حاصل کی ہے۔ ملک کے سیاسی اُفق پہ اس وقت میرا نام ایک بے داغ شخصیت رکھنے والے سیاست دان کا ہے۔ لیکن اب لوگ میرے بارے میں چہ میگوئیاں کریں گے۔ جسے اس کے خاندان والے، اس کا باپ قابلِ اعتبار نہ جانیں، عوام کیسے اس کی ذات پہ بھروسہ کر لے گی۔ اگر آپ

urdu.com
URDU PHOTO

نے اپنا فیصلہ نہ بدلا تو اس بار الیکشن میں میرا جیتنا ناممکن ہے۔ آپ جانتے ہیں ہماری پختون برادری کی ذہنیت کو وہ لوگ خاندانی ناموس کو اوّل جانتے ہیں۔ برائے مہربانی اپنے فیصلے میں ترمیم کیجیے۔" وہ منت پہ اُتر آئے۔

"میرا فیصلہ..... اٹل..... ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔" وہ جیبوں میں ہاتھ ٹھونستے کھڑے ہو گئے۔

"میں اپنا حق وصولنا بخوبی جانتا ہوں۔ اپنی برسوں کی محنت سے حاصل کیا گیا یہ مقام ہر حال میں بچاؤں گا۔ اپنے بل بوتے پہ بنائے اپنے سیاسی کیریئر کو میں آپ کی بلاوجہ کی ضد پہ ہرگز قربان نہیں کروں گا۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولے تو اب تک خاموش بیٹھے چچا جان اور بی بی جان بھی چونک اُٹھیں آخر دراب چچا نے بولنے میں پہل کی۔

"وہ ہمارے پاس زریاب لالہ کی امانت ہے بڑے لالہ۔ یہ بات آپ کو یاد رکھنی چاہیے۔"

"جانتا ہوں، اسی لیے تو..... اس لیے تو۔" وہ مٹھیاں بھینچنے لگے۔

"ورنہ اس کی صورت مجھے اس نامراد، بدبخت عورت کی یاد دلاتی ہے۔ جس کی یاد نے ہاتھ تھام رکھا ہے۔ اس نے جاتے ہوئے منت کی تھی میری کہ یہ لڑکی اس خاندان میں ہی رہنی چاہیے۔ اس کی ماں کا سایہ بھی نہ پڑنے پائے اس پہ۔"

"اور ہمیں یہ عہد نبھانا ہی ہے۔" دراب خٹک نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

"خاص طور پر اس لیے کہ اب زریاب لالہ کے آنے میں دیر ہی کتنی ہے۔ میرا تو خیال ہے باچا جان کہ آپ کچھ عرصہ مزید انتظار کر لیں۔ لالہ کے آنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ لیجیے گا۔" ان کی باوثوق پیشن گوئی سُن کر مقدس پوری طرح حواسوں میں آ گئی، اب اسے اپنی آنکھیں موندے رکھنا دشوار لگنے لگا۔

"کہاں ہیں میرے بابا؟"

"کب آنے والے ہیں وہ؟"

"کیوں اتنے عرصے سے غائب ہیں وہ؟"

ان سب سوالوں کے جواب وہ کمرے میں موجود نفوس کے چہروں سے کھرچ کر پڑھنا چاہتی تھی۔

"اور کیا پتا وہ بھی اس بدبخت کی صورت دیکھنا چاہے گا یا نہیں۔" بی بی جان کے سفاک تبصرے نے اسے آنکھیں کھولنے سے پھر روک دیا۔

"اسی لیے..... اسی لیے تو..... میں یہ..... یہ کر رہا ہوں اتنے سالوں سے وہ ہم سب

کی وجہ..... کم از کم اب تو..... اسے اولاد کا سکھ، اس کے دل کو صاف کرنا ہے۔" باچا جان کی دشوار اُکھڑی سانسوں میں مدھم فقروں سے چند الفاظ بے ربط سے انداز میں اس کے کانوں میں پڑے۔

"بے وفائی کے داغ یونہی نہیں صاف ہو جاتے دلوں سے۔" دراب چچا تلخی سے بولے۔ "نجانے کیا دُھن سوار ہو گئی ہے آپ کو باچا جان، بھلا جائیداد میں اس لڑکی کو حصہ دار بنانے سے ان ساری باتوں کا کیا تعلق ہے۔ کیا مل جائے گا اس سارے بکھیڑے سے۔"

"تلافی۔" باچا جان کے لبوں سے کراہ کی صورت ایک لفظ نکل کر فضا میں ٹھہر گیا۔ لمحہ بھر کو سب ساکت ہو گئے۔ تایا جان اور چچا جان کی خاموشی میں استعجاب تھا اور بی بی جان کے سکوت میں کسی انہونی کا خدشہ۔

"کیسی تلافی کیا ظلم ٹوٹے ہیں یہاں اس پہ۔" کچھ دیر بعد تایا جان گویا ہوئے۔

"کیا اس کی تعلیم یا تربیت میں کسی بات کی کمی رہ گئی ہے۔ رہی بات لاڈ پیار جتانے کی تو یہ دلوں کے معاملے ہیں اور خٹک خاندان میں کوئی منافق نہیں۔ جو وجود آپ کے کھرنڈ کھرچتا رہے اسے آپ سر آنکھوں پہ تو نہیں بٹھا سکتے۔ یہی کیا کم ہے کہ وہ اس عورت کی بیٹی ہونے کے باوجود اس چھت تلے رہتی آئی ہے۔ پھر بھی..... پھر بھی اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہاں اس کے ساتھ کوئی ناانصافی ہوئی ہے اور اس کا احساس آپ کے دل پر بوجھ بڑھا رہا ہے تو اس کی تلافی کا کوئی اور طریقہ بھی تو ممکن ہوگا۔" تایا جان ہر صورت وہ فیصلہ بدلنا چاہتے تھے۔ کمرے کے طول و عرض میں ان کے بے تابانہ گھومتے قدموں کی دھمک اسے بخوبی سنائی دے رہی تھی۔

"[illegible] ہے [illegible] کون اسے اپنے بیٹے کے لیے عزت دے گا۔" اس پیش کش پہ بی بی جان چونکیں۔ تایا جان اور چچا جان محض ایک دوسرے کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتے رہ گئے اور خود مقدس..... وہ تو متوقع انکشافات سے لرز رہی تھی۔

"لیکن افراسیاب کا ایک ہی بیٹا ہے اور سب جانتے ہیں وہ شاور سے منسوب ہے۔" بی بی جان نے خفگی بھرے انداز میں جتایا۔ "اور دراب کے دونوں لڑکے۔" انہوں نے کچھ کہنے سے قبل بیٹے کی طرف دیکھا وہ محض کندھے اچکا کر رہ گئے۔ ان کا تعلق اپنی اولاد سے ایسے ہی تھا۔

"نہیں بی بی جان وہ دونوں ہی اس سے پانچ چھ سال چھوٹے ہیں۔ کیوں باچا جان۔" تایا جان نے کہا۔

"ہاں..... اتنا فرق..... یہ تو ظلم ہوگا اس پہ..... ایک اور ظلم۔"

Lubna Urdu Photo

"کیوں خان!" بی بی جان نے دُکھ بھرے انداز میں پوچھا۔ "میری بیٹی کے لیے کسی کو بارہ سال کا فرق نظر نہ آیا۔ اس بدنصیب پہ کس نے یہ ظلم توڑا۔ کبھی اپنی اکلوتی بیٹی کے ساتھ کی گئی ناانصافی کی تلافی کا خیال آیا آپ کو۔" تایا جان کے جھریوں بھرے چہرے پہ دو آنسو پھسل گئے۔ ان کی سانسوں کا زیروبم پھر پریشان ہونے لگا۔

"خدا کے لیے بی بی جان۔ اس قسم کے مسئلے مت چھیڑیں۔ ان کی حالت دیکھیں آپ۔" کب سے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کے بیٹھے دراب خٹک نے لپک کے باپ کو سنبھالا اور ان کا سینہ سہلانے لگا۔ افراسیاب خٹک نے نرس کو کال دے دی۔

"بی بی جان، خود کو سنبھالیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ باچا جان بھی ٹھیک کہتے ہیں اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ بہرحال دراب کی بات میں بھی وزن ہے زریاب کے آنے میں چند ماہ ہی رہ گئے ہیں۔ تب تک کے لیے اس مسئلے کو اٹھا کے رکھ دیں۔ جو فیصلہ وہ کرے گا، مجھے اور دراب کو اعتراض نہیں ہوگا۔ نہ تو اس خاندان میں دو بیویاں رکھنے کا پہلا واقعہ ہوگا اور نہ ہی عمروں کا فرق کوئی انہونی چیز ہے، یہاں سب ہوتا چلا آیا ہے۔" افراسیاب خٹک نے تسلی دی۔

"باچا جان کو آکسیجن لگانے کے بعد نرس اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"اٹھو، بے بی، کیا تم سن رہی ہو..... ہیلو" اس کے گال تھپتھپانے کے ساتھ ساتھ وہ اس پہ پانی کے چھینٹے بھی دیتی گئی۔ اب مقدس کے لیے بے سدھ پڑے رہنے کی ایکٹنگ کرنا دشوار ہو گیا۔ وہ ہلکا سا کسمسائی۔ اسے اُٹھتا دیکھ کر وہ تینوں یوں چونکے جیسے اب تک اس کی موجودگی سے لاعلم ہوں۔ کمرے میں ایک بار پھر سکون چھا گیا۔ وہ نرس کا سہارا لیے دھیرے دھیرے چلتی کمرے سے نکل گئی۔ اس نے نجانے کون سی ٹیبلٹ کھلائی تھی کہ سر بھاری ہوتا جا رہا تھا اور آنکھیں نیند سے بوجھل۔

☆☆☆

"ہیلو سویٹ کزن، کمال ہو گیا آج تو، اتنی لمبی نیند؟" آنکھ کھولتے ہی خود پہ شناور کو جھکے پایا۔ وہ تکیہ اُونچا کر کے ذرا سا اٹھ بیٹھی۔ دماغ ابھی بھی نیم خوابیدہ تھا لیکن پورا وجود سبک سا ہو رہا تھا۔ اس نے ہلکے پھلکے ہونے کے اس احساس کو سرفیک کر پوری طرح محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن دوبارہ سے آنکھ بند کرتے ہی باچا جان کے کمرے میں ہونے والی کارروائی کی بازگشت سنائی دینے لگی وہ ایک جھٹکے سے بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا؟ ابھی طبیعت نہیں سنبھلی کیا؟" شناور تشویش سے بولی۔

"نہیں اب ٹھیک ہوں میں، پہلے سے بہت بہتر۔"

مقدس نے خشک لبوں پہ زبان پھیری۔ "شانو..... تمہارے پاس بابا جان کی اسٹوڈیو کی چابی ہے ناں؟"

"ہاں..... ابھی تک میرے ہی پاس ہے، کچھ فوٹوگرافس ہیں، ماموں جان کے کھنچے ہوئے جن سے میں لینڈ اسکیپ کے آئیڈیاز لینا چاہتی ہوں، لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو۔" وہ حیران تھی کل تک تو وہ کوئی دلچسپی نہیں لینا چاہتی تھی۔

"آج رات کو وہ چابی مجھے دے دینا۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"ابھی لو، رات تو ہو چکی، ساڑھے نو بج رہے ہیں۔ جناب، آپ پورے پانچ گھنٹے سوئی ہیں۔" اس نے گچھا اس کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

"لیکن نہیں، پہلے تم کچھ کھا لو، وگمہ سے کھانا منگواتی ہوں، وگمہ..... وگمہ۔" وہ کمرے کے دروازے سے جھانک کر ملازمہ کو بلانے لگی۔

"سنو شانو، مجھے کافی کے ساتھ بسکٹس یا ایک آدھ سینڈوچ منگوا دو، بس اور کچھ نہیں۔"

کافی آنے کے بعد وہ جلدی جلدی سینڈوچ نگلنے لگی۔ گرم گرم کافی کے بڑے بڑے گھونٹ بھرتے ہوئے اس کی نظریں بے تابی کے ساتھ لمبی نقرئی چابیوں والے اس گچھے پہ پھسلتی رہیں۔

"میں چلوں تمہارے ساتھ۔" اسے گرم شال لپیٹتے دیکھ کے شناور نے پوچھا۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بے آواز قدموں کے ساتھ لمبی راہداری میں مڑ گئی۔ راہداری کے اس طرف [illegible] کے کمرے تھے اور سامنے کی لائن میں دو اسٹور رومز کے درمیان بی بی جان کا کمرہ تھا جس میں سارا دن ملازماؤں اور مہمان خواتین کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد کوئی اس طرف آنے کی ہمت نہیں کرتا تھا کیونکہ انہیں جلد سو جانے کی عادت تھی۔ مقدس کو ان کے تہجد کے لیے اُٹھنے سے قبل واپس کمرے میں پہنچنا تھا۔ راہداری کا موڑ کاٹ کر وہ ایک لمحے کے لیے رُکی۔ گولائی میں، نیچے لاؤنج میں نیم تاریکی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ بائیں جانب باچا جان کے کمرے میں موجود نرس اور اٹینڈنٹ ساری رات چوکس رہتے ہیں، سامنے کھانے والے کمرے اور ڈرائینگ روم کی لائٹس بھی آف تھیں لیکن ان کے پیچھے وسیع کچن میں اس وقت تمام ملازمائیں ہلکی پھلکی گپ شپ کے ساتھ سارے دن کا پھیلاوا سمیٹ

Urdu.com
Urdu Photo

رہی ہوں گی اور دائیں جانب دراب چچا کے حصے میں بھی زندگی جاگ رہی ہوگی۔

انوشہ اور پلوشہ کے کمرے تو اُوپر والے پورشن میں اس کے کمرے کے ساتھ ہی تھے، لیکن ان کے بھائیوں کے کمرے والدین کے ساتھ ہی متصل تھے۔ دراب چچا کی راتیں جاگتی تھیں اب بھی مردانے میں، جسے ان کے ہاں ''حجرہ'' کہا جاتا ہے۔ ان کے دوستوں کی محفل عروج پہ ہوگی۔ اگرچہ حجرہ اس عمارت سے باہر لان کے دائیں طرف بالکل الگ تھلگ ہے، لیکن مقدس جانتی تھی کہ چچی جان دراب چچا کی غیر موجودگی میں سوئی جاگتی کیفیت میں رہتی ہیں اور رات بھر اُٹھ اُٹھ کر کچن میں جا کر ملازماؤں کے ہاتھ کبھی چائے، کبھی قہوہ خشک میوہ جات کے ساتھ بھجواتی رہتی ہیں۔ اس لیے وہ نہایت احتیاط سے چلتی ہوئی اُوپر کی طرف جاتی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اس نے سیڑھیوں کی لائٹ بھی آن نہیں کی، حتیٰ کہ ہاتھ میں دبی ٹارچ کی مدد بھی نہ لی۔ اوپر آ کے اس نے اندھیرے میں آنکھیں پوری کھول کر دیکھنے کی کوشش کی۔

سامنے کی طرف ٹیرس سے لان میں جلتی لائٹس کی روشنی اندر تک آ رہی تھی، ساتھ ہی رات کے اس پہر کی ٹھنڈک تمام تر سفاکی کے ساتھ ہڈیوں میں اُترتی چلی جا رہی تھی۔

وہ اس پورشن میں پہلی بار آئی تھی۔ یہاں بابا جان کا بیڈ روم، ان کی اسٹڈی اور اسٹوڈیو تھا۔ اس نے سب سے پہلے دروازے میں ایک ایک کر کے چابیاں لگانا شروع کر دیں۔ اگرچہ شناور نے اسے چابیوں کے نمبر بتا دیئے تھے لیکن تاریکی کی وجہ سے وہ نمبر پڑھنے سے قاصر تھی اور کمرے میں جانے سے پہلے لائٹ جلانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ آخر کار چوتھی چابی ڈالتے ہی لاک ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ کھل گیا۔

اس نے ہینڈل گھما کے دروازہ دھکیلا، کم استعمال ہونے کی وجہ سے دروازے میں چرچراہٹ سی پیدا ہوئی اس نے سہم کے خود کو ساکت کر لیا اور دم سادھے کھڑی رہی۔ چند لمحے اطمینان کر لینے کے بعد اس نے دروازہ مزید کھولنے کی بجائے ترچھا ہو کے سرکتے ہوئے اندر آنا زیادہ بہتر جانا۔ اندر کی خنک تاریکی میں اس کے جسم پہ ایک عجیب سا لرزہ طاری ہو گیا۔ کئی منٹ لگا کے آہستہ آہستہ رُک رُک کے اس نے دروازہ دوبارہ بند کیا۔ اس سے پہلے وہ اس کمرے میں کبھی نہیں آئی تھی، اس لیے اندازے کے ساتھ ٹٹولتی ہوئی کھڑکی کے پاس آئی اور پردے برابر کرنے کا اطمینان کیا تاکہ اندر کی روشنی باہر نہ جائے پہلے اس نے ٹارچ آن کی۔ ہلکی زرد روشنی میں سفید سفید لمبے چوڑے سائے اسے خوفزدہ

کر گئے۔ جلدی سے سوئچ بورڈ پہ ہاتھ مار کے اکٹھے دو تین بٹن نیچے کر دیئے۔ ٹیوب لائٹ کے ساتھ ایک لیمپ اور پنکھا بھی آن ہو گیا۔ وہ لمبے سفید سائے دراصل جہازی سائز کے صوفوں اور بیڈ پہ ڈھکی سفید چادروں کے تھے۔ پنکھے کی تیز ہوا نے اس کے دانت کڑکڑا دیئے۔ پھر سے پنکھے اور ٹیوب لائٹس کے بٹن آف کرتے ہوئے وہ لیمپ کی خوابناک روشنی میں کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

شناور نے پہلے ہی بتایا تھا کہ اس کمرے میں اس کے بابا جان اور مما کی کوئی تصویر موجود نہیں پھر بھی اس نے ڈریسنگ ٹیبل اور بیڈ کی سائیڈ ٹیبلز کی ایک ایک دراز کو کھنگال لیا۔ ان میں پرانے اخبار، چند ایک کاروباری نوعیت کی بوسیدہ فائلز اور رسالے موجود تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل پہ کنگھی، چاندی کا جیولری باکس موجود تھا۔ دروازوں میں ڈھیروں چھلکے اور سوکھے گجرے پڑے تھے، لیکن کہیں اس کے ماں باپ کی کوئی تصویر موجود نہ تھی۔ شاید کسی نے پورا کمرہ جوں کا توں چھوڑتے ہوئے صرف اس جگہ سے اس کی ماں کی موجودگی کے اثرات کو غائب کیا تھا وہ بغلی دروازہ کھول کے اسٹوڈیو میں داخل ہوئی۔ دیواروں پہ کئی قدرتی مناظر مہارت سے پینٹ کیے ہوئے تھے۔ زمین پہ رنگوں کے ڈبوں اور ٹیوبز کا خشک ہوا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ یہ کمرہ گرد سے اَٹا پڑا تھا، شاید صفائی کرنے والے نے ادھر کا رُخ نہیں کیا تھا۔

لان میں کھلنے والی کھڑکی کا شیشہ شاید نیچے کی طرف سے ٹوٹا ہوا تھا اور اس درز سے آتی ٹھنڈی ہوا اسے کپکپائے دے رہی تھی۔ شیلف میں ڈھیروں البمز اور نگیٹو پڑے تھے۔ اس نے ایک آدھ گھنٹے کے دوران اسے ان تصویروں میں سے کچھ ایسے اسرار ہر قیمت پر حاصل کرنے تھے جو اس کی کو سلجھا سکیں۔

''لیکن اس سے پہلے کیوں نہ میں اسٹڈی میں بھی ایک نظر ڈال ہی لوں۔'' اس نے سوچا اور اسٹڈی کے دروازے میں چابی گھمائی۔ اگرچہ شناور پہلے ہی اسے آگاہ کر چکی تھی کہ اسٹڈی کی تمام بکس وہ دیکھ چکی ہے اور ان میں ایسی کوئی بات موجود نہیں جو اس کی الجھن ختم کر سکے، پھر بھی وہ طائرانہ نظروں سے تمام شیلفوں اور الماریوں کا جائزہ لینے لگی۔ بلاشبہ کتابوں کی یہ کولیکشن اس کے بابا جان یا مما کے ذوق کی عکاسی کر رہی تھی، کہیں کلاسک انگلش لٹریچر کا خزانہ تھا تو کہیں جدید اُردو شاعری کا ذخیرہ، سیاست، تاریخ اور مذہب پہ بھی لٹریچر موجود تھا۔ ایک بند الماری کے آگے وہ رُک کے کھڑی ہو گئی۔ شیشے میں

Urdu.com
URDU PHOTO

سے نظر آتی سیاہ مخملیں جلد والی وہ موٹی موٹی کتابیں، جن پہ کوئی نام نہیں لکھا تھا، البمز بھی ہو سکتی تھیں اور ڈائریاں بھی۔ اس نے بے تابی سے تمام چابیاں ایک ایک کر کے اس میں گھمانے کی کوشش کی۔ لیکن بے سود۔ جھنجھلاہٹ سے اس نے ہنڈل کو کئی جھٹکے دیئے پھر مزید وقت ضائع نہ کرتے ہوئے دوبارہ اسٹوڈیو آ گئی۔

ایک کے بعد ایک البم کھولتے ہوئے وہ حیران ہوتی گئی۔ سوئٹزر لینڈ، فرانس، اسکاٹ لینڈ سے لے کر اہرام مصر، خانہ کعبہ تک کے مناظر عکس بند کیے گئے تھے۔ تاج محل سے لے کر نیاگرا فال کی رفتار تک کیمرے کی زد میں تھی۔ وہ دس بارہ البمز کھنگال بیٹھی۔ لیکن اس سے سوائے اس راز کے اور کچھ ثابت نہ ہوا کہ اس کے بابا جان نہ صرف ایک حساس مصور ہیں، ایک ماہر فوٹو گرافر ہیں، بلکہ ایک سیلانی سیاح بھی رہ چکے ہیں۔ اس نے وقت کی کمی کے پیش نظر باقی البمز دیکھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ بی بی جان کے تہجد کے لیے اُٹھنے سے قبل وہ یہاں سے جانا چاہتی تھی اس لیے تمام البمز ترتیب سے رکھیں۔ ایک کونے میں ایک میلا کچیلا سا تولیہ کسی کھونٹی پہ لٹکا تھا۔ تولیے کا ایک کونا چند البمز کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ تجسس سے بے قرار ہو کے وہ جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اس طرف بڑھی۔ شاید کسی نے ارادتاً ان البمز کو ڈھک کے رکھا ہو، اس نے تولیہ کھینچا اور ان البمز کا جائزہ لیا، ایک تو پھولوں کی کسی نمائش کی تھی اور دوسرے کے ٹوکو سر کرنے والے کوہ پیماؤں کے کسی گروپ کی۔

اس نے سخت مایوسی کا شکار ہوتے ہوئے ڈھول میں اُلٹے اس اکڑے ہوئے بدرنگ تولیے کو دوبارہ کھونٹی سے لٹکانا چاہا تو وہاں جھولتی ایک سنہری چابی پہ اس کی نظر جم گئی۔ ایک زنجیر کے ساتھ دوسرے کونے پہ دل نما کوئی چیز جھول رہی تھی، اس نے چابی اُتار لی اور میکانکی انداز میں اسٹڈی میں گھس گئی، مقفل الماری میں وہ سونے کی چابی گھماتے ہی کلک کی آواز آئی اور مقدس کا دل جیسے اُچھل کر حلق میں آ گیا۔

اس کا اندازہ درست تھا۔ بابا جان کو مصوری، سیاحت اور فوٹو گرافی کے ساتھ ساتھ ڈائری لکھنے کا بھی شوق تھا۔ ایک ترتیب کے ساتھ سال بہ سال لکھی سیاہ کور والی ڈائریاں اپنے اندر اس کے ہمہ صفت باپ کے کتنے راز چھپائے پڑی تھیں۔ چوہتر، پچھتر، چھیتر سے ہوتے اس کے ہاتھ انیس سو اسی کی ڈائری پہ رک گئے۔ یہ اس کی پیدائش سے ایک سال پہلے کا سن تھا اور یہی یہاں موجود آخری ڈائری تھی۔ اس نے شال کے اندر اسے کسی متاع عزیز کی طرح چھپایا اور جس خاموشی سے آئی تھی ویسے ہی واپس چلی گئی۔

☆☆☆

"خیریت تو ہے، بہت دیر لگا دی۔" شناور حسب توقع اس کے انتظار میں دروازے پہ ہی تھی۔

"ایک گھنٹہ بھی نہیں لگا۔" اس نے شال ایک طرف پھینکی۔ وہ جس طرح ٹھٹھرتی ہوئی گئی تھی، اب اتنی ہی پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔

"کچھ ملا؟" اس نے پانی کا گلاس اسے تھمایا جسے مشکور نظروں سے تھماتے ہوئے وہ اثبات میں سر ہلا گئی۔

"یہ ڈائری" اس نے ہاتھ میں پکڑی ڈائری لہراتے ہوئے گلاس لبوں سے لگا لیا۔ شناور نے کچھ اور کہنا فی الحال مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے اپنی رائٹنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئی اسے نوٹس مکمل کرنا تھا۔

لحاف میں دبک کر کانپتی انگلیوں، دھڑ دھڑ کرتے دل اور پیاسی آنکھوں کے ساتھ اس نے ڈائری کھولی۔

۱۲ مئی ۱۹۸۰ء

تھکاوٹ سے جسم ٹوٹ رہا ہے اور یہ تھکاوٹ پورا ایک مہینہ گھر گزارنے کی ہے۔ پیر کے چکر کہیں ٹک کے بیٹھنے ہی نہیں دیتے۔ ایک مدت ہوئی گھر میں اتنا وقت گزارے ہوئے لیکن زرسانگہ باجی کی شادی، اتنے ڈھیروں کام۔ اتنی ذمہ داریاں..... بڑے لالہ کا پہلا پہلا الیکشن تھا تو دراب کا لاسٹ سمسٹر دونوں کی تمام تر توجہ اسی جانب پا کے باجا جان نے مجھ پہ نظریں لگائیں تو میں نے بھی اپنی سیلانی فطرت کو کچھ روز کے لیے تھپک کے سلا دیا اور اپنی اکلوتی بڑی بہن کی شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بے جی، میری اپنی بیٹیوں جیسا پیار کرتی تھیں حالانکہ بی بی جان سے ان کی کم ہی بنتی تھی۔ دراب لالہ کے بعد ان کے ہاں دو بیٹیاں ہوئیں تو مگر زیادہ دن جی نہ سکیں اور جب بی بی جان کے پہلوٹھی کی بیٹی ہوئی تو بے جی نے کتنی خواہش کی تھی کہ اب ان کے ہاں بھی ایک بیٹی ہو۔ زرسانگہ جیسی پیاری پیاری سی، لیکن میں آ گیا ان کا دوسرا بیٹا۔ پھر وہ جتنا عرصہ زندہ رہیں بیٹی کے حصے کی ممتا انہی پہ لٹاتی رہیں، اسی لیے زرسانگہ باجی سے میرا تعلق اور گہرا ہو جاتا ہے ان میں مجھے بے جی کی خواہش کا عکس جھلملاتا نظر آتا ہے۔ کتنے پریشان رہتے تھے سب ان کے لیے، وہ خاندان جس میں سولہ سترہ سالہ لڑکی کا بن بیاہے رکھنا ہی ممنوعہ ہو وہاں میری بہن تیسواں سال شروع ہونے تک بھی..... خیر..... شکر ہے

urdu.com
URDU PHOTO

رب العزت کا جس نے آفریدی خاندان کی نظر اس پہ ٹھہرادی۔ اس خاندان سے ہمارے اور بھی رشتے نکلتے ہیں اس حوالے سے یہ لوگ ہمارے لیے اجنبی بھی نہیں۔ اپنے ہی اپنوں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں، یہ بات بی بی جان اکثر کہا کرتی ہیں۔

رحیم گل آفریدی عمر میں زرسانگہ باجی سے چند برس چھوٹا ضرور ہے، لیکن آفریدی اور خٹک خاندان میں اتنا کچھ ہوتا چلا آیا ہے کہ اب کچھ بھی انہونی بات نہیں لگتی۔ اب باچا جان کو ہی لیجیے۔ ان کے والد اور والدہ دونوں اپنے اپنے بھائیوں کی بیٹیاں لانا چاہتے تھے، باچا جان نے میری بے جی یعنی اپنی چچازاد سے شادی کے ڈیڑھ برس بعد ہی بی بی جان یعنی اپنے ماموں زاد سے بھی نکاح کرلیا اور اس کے علاوہ..... اب کیا کیا لکھوں۔ رشتوں کی ڈور میں اتنے بل ہیں کہ ایک کا ذکر چھیڑو تو دوسرا قصہ نکلتا چلا آئے اسی لیے میں سارے ماحول سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہر وقت خاندانی مسائل، جائیداد کی تقسیم کے تنازعے، وراثتی جھگڑے وغیرہ وغیرہ۔ بس تو بس مزاج ایسا بدلنے سال میں دو تین بار ایک آدھ ہفتہ یہاں رہنے چلا آتا ہوں۔ اس بار بھی کچھ زیادہ دن لگ گئے۔ کل ہی شادی کے ہنگامے ختم ہوئے ہیں اور میں سخت بوریت محسوس کررہا ہوں۔ آج رات سونے سے پہلے یہ فیصلہ کرکے رہوں گا کہ میرا اگلا پڑاؤ کون سا ہوگا۔

۱۳ مئی ۱۹۸۰ء

کل رات جب میں اپنے متوقع سفر کے بارے میں سوچ رہا تھا تو مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ مصر، لبنان اور شام سے لے کے چین، ملائیشیا، نیپال تک اور فرانس، امریکہ سے لے کر سوئٹزرلینڈ اور جاپان تک میں آدھی سے زیادہ دنیا گھوم چکا تھا اور ان ہی جگہوں پہ دوبارہ جانے کا میرا کوئی موڈ نہیں تھا۔ میری آنکھ کیمرے کا کام دیتی ہے ایک بار جو دیکھ لوں ذہن کی سلیٹ پہ نقش ہوجاتا ہے اور میں ہو بہو اسے کینوس پہ آنکھ بند کرکے بھی اُتار سکتا ہوں اس لیے کئی بار کی دیکھی جگہیں میرے لیے کسی دلچسپی کا باعث نہ تھیں۔ اسی ذہنی کشمکش میں مجھے فیروز خان وردگ کی آفر یاد آئی۔

پچھلی سردیوں میں جب باچا جان کے ساتھ ان کے دوست بسم اللہ جان کی شکار کی دعوت پہ سوات گیا تھا تو وہیں فیروز سے ملاقات ہوئی تھی۔ بسم اللہ جان والی سوات کے خاندان سے ہیں، سوات کے آخری ولی عہد کیپٹن میاں گل اورنگ زیب خان ان کے والد کے قریبی عزیز تھے، اسی حوالے سے پورے سرحد اور خصوصاً آزاد قبائل کے چیدہ

چیدہ خاندانوں کے خان مدعو تھے ان میں یوسف زئی بھی تھے، شنواری اور خٹک بھی اور وردگ بھی، بعض ٹیکل خان حضرات تھے بعض اپنے خول سے باہر آنے کی کوشش میں مصروف ان ہی میں فیروز خان وردگ مجھے چونکا گیا۔

غضب کا ذہن پایا ہے اس شخص نے، تعلیم اگرچہ اس کی رسمی سی ہے لیکن اس کی ذہنی اپروچ اور پختون تاریخ کے بارے میں اس کی معلومات قابلِ رشک ہیں، بہت کم وقت میں اچھی خاصی دوستی ہوگئی، میری اس سے۔

میرے سیاحت کے شوق کے بارے میں جان کے اس نے مجھے آفر کی تھی کافرستان وادی کیلاش کے دورے کی، اس کی زبانی وہاں کے واقعات سُن سُن کر میں تو تب ہی ارادہ کرچکا تھا جانے کا لیکن فیروز نے منع کردیا کہ سردیوں میں برف باری وہاں تک کے تمام راستے مسدود کردیتی ہے، ان علاقوں میں جانے کا آئیڈیل وقت مئی سے ستمبر تک کا ہے۔ اس سے کیا وعدہ یاد آنے پر میں نے فوراً ہی وہاں جانے کا ارادہ کرلیا ہے۔ کل ہی صبح فجر کے بعد میں پشاور سے سوات کے لیے روانہ ہوجاؤں گا۔ انشاءاللہ

۱۴ مئی ۱۹۸۰ء

اس وقت میں فیروز خان کی سفید اینٹوں سے بنی حویلی کے مردان خانے کے منقش جالی کے پاس بڑے سے گیس لیمپ کے نیچے بیٹھا یہ ڈائری لکھ رہا ہوں۔ رات گئے تک فیروز کے دوستوں کی محفل جمی رہی میری آمد کی خوشی میں اور اب وہ مجھے گھنٹہ دو گھنٹہ آرام کی تاکید کرتے ہوئے گیا ہے، تاکہ صبح کا اُجالا پھیلتے ہی سفر پہ نکل جائے، لیکن میں بھلا ڈائری لکھے بغیر سو سکتا ہوں۔

یوں تو میں سات آٹھ بجے کے درمیان ہی سوات پہنچ گیا تھا لیکن فیروز کے گھر شام [illegible] کی رہائش سوات کے صدر مقام سیدو شریف میں ہے وہاں تک پہنچ کے اس کی حویلی جاتے ہوئے عجیب سی جھجک نے مجھے آن گھیرا درمیانی عرصے میں، میں نے اس سے کوئی رابطہ نہ رکھا تھا اور اب اچانک اسے میزبان کا شرف بخشنے پہنچ رہا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے کسی ہوٹل کی راہ لینے کا فیصلہ کیا۔ سیزن ہونے کی وجہ سے سرینا، مرغزار اور پی ٹی ڈی سی جیسے پائے کے تمام ہوٹل بک تھے۔ میں نے نسبتاً درمیانے درجے کے ''ریلم'' میں کمرہ بک کروایا اور وہاں پہنچ کے فیروز سے رابطہ کیا لیکن وہ گرم جوش پٹھان زادہ میری آواز سنتے ہی دیوانہ ہوگیا۔

Urdu.com
URDU PHOTO

اور چند منٹ کے اندر اندر مجھے لینے آ گیا۔

سوات کے پُر رونق بازار گھماتا ہوا وہ مجھے اپنی حویلی لے کے آیا۔ پُر تکلف پکوانوں، خوشبودار قہوؤں کے درمیان گپ شپ لگاتے کب رات بیت گئی پتہ ہی نہیں چلا، اب مجھے تھکاوٹ سی محسوس ہونے لگی ہے۔ میرا خیال ہے کچھ دیر کمر سیدھی کر ہی لی جائے۔

۱۵ مئی ۱۹۸۰ء

اور اس وقت میں گویا جنت کے ایک قطعے پہ بیٹھا خود کو یہ یقین دلا رہا ہوں کہ میں واقعی اس منظر کا ایک حصہ ہوں۔ مجھے حیرانی ہے کہ پشاور میں رہنے کے باوجود میں اپنے اس قدر قریب واقع ان حسین وادیوں سے اب تک انجان کیسے رہا، دنیا بھر سے لوگ نجانے کتنا کتنا لمبا سفر طے کر کے یہ جنت نظیر مقام دیکھنے آتے ہیں، فیروز نے بتایا۔

''سوچیان، فاھان، سانگ یون، ہیون سانگ اور اوگیان یا کے سفرنامے کیلاش کے چپے چپے کے قصیدوں سے بھرے پڑے ہیں۔ یہ بدھ مت کا اہم مقام بھی ہے۔ دُنیا بھر سے بدھ مت کے ماننے والے یہاں اپنی مذہبی رسومات کی ادائیگی کے لیے آتے ہیں۔ سوات کا ایک سابق بادشاہ ''اجی تابا'' بدھ مت کا مذہبی رہنما بھی تھا اور ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی ضرور واپس لوٹے گا وہ دن بدھ کا اور تاریخ ۲۶ ہوگی۔''

اس کے علاوہ بھی اس نے ان اطالوی، فرانسیسی اور برطانوی سیاحوں کے اقتباسات سنائے جو سوات اور کالاش سے مسحور ہو کے رہ گئے تھے۔ میں بھی اس وقت دنگ رہ گیا تھا، جب سیدو شریف سے تقریباً بو کلومیٹر کے فاصلے پہ واقع مشہور چوٹی ''فلک سیر'' میری نگاہوں کے سامنے آئی۔ میرا تو دل ہی نہ چاہتا تھا اتنی جلدی وہاں سے کوچ کرنے کو لیکن سفر طویل بھی تھا اور پر پیچ و دشوار گزار بھی۔

''تم کہاں کہاں رکو گے۔ یہاں سے ایوان تک کا راستہ یوں پھولوں سے لدا اور کہساروں، آبشاروں سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن اب ہمیں ایوان تک بغیر رُکے سفر کرنا ہے۔'' فیروز نے تنبیہ کی۔

''ایوان؟'' میں اپنی لاعلمی پہ خاصا شرمندہ تھا۔

''ہاں چترال سے آگے یہ سرسبز گاؤں کافرستان کا دروازہ کہلاتا ہے۔ یہاں سے ہی کیلاش کی وادیوں کو راستے نکلتے ہیں۔''

''کیا یہ کوئی ایک وادی نہیں ہے۔''

''نہیں وادی کیلاش بمبوریت، بریر اور رمبور نامی تین حصوں پہ مشتمل ہے۔ تینوں کا قدیم مذہب آتش پرستی اور ناگ پرستی ہے۔ لیکن یہ لوگ تین قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں بظاہر ان کا بود و باش ایک سا ہے، لیکن بمبوریت نسبتاً ترقی یافتہ کہلایا جا سکتا ہے۔'' ایوان پہنچ کر فیروز نے جیپ اپنے ایک جاننے والے مقامی شخص کے حوالے کی۔ ''ان راستوں پہ ڈرائیونگ صرف یہاں کے ماہر ڈرائیور ہی کر سکتے ہیں۔''

''تو اب ڈرائیور کہاں سے لیا جائے۔'' اندھیرا پھیلنے کی وجہ سے میں فکر مند تھا۔

''چلو اڈے چلتے ہیں، وہاں دن میں ایک دو بار ویگن آتی ہے اور مسافر بھر کے ''دو باش'' لے جاتی ہے۔'' اڈے پہ کئی سیاح گروپ بنائے کھڑے تھے، کچھ ہی دیر میں ایک بس آئی اور سب لوگ کرایہ ملا کے ڈرائیور کو دینے کے بعد اپنے اپنے سامان سمیت اس پہ سوار ہو گئے۔ فیروز کا کہنا درست تھا واقعی اس پُر خطر پہاڑی راستے پہ ڈرائیونگ کرنا اناڑی شخص کے لیے رسکی تھا۔ دو باش کے مقام پہ فیروز کا ایک مقامی دوست ژان خان جیپ لیے کھڑا تھا۔ منحنی سا وجود، سرخ و سفید رنگت، بادامی شلوار سوٹ پہ براؤن جیکٹ سیپوں سے بھری ہوئی قلعی والی روایتی ٹوپی کے ساتھ وہ خوش مزاج شخص، حد سے زیادہ مہمان نواز لگ رہا تھا۔ راستے میں میں نے آہستہ آواز میں پوچھا۔

''یار افیروز خاناں، یہ بندہ ژان خاں کیا ہے؟ میرا مطلب ہے ژان بھی اور خان بھی۔ ژان تو بدھسٹ نام ہے تو پھر یہ خان؟'' وہ زور سے ہنس پڑا۔

''آگے آگے دیکھو، ہوتا ہے کیا۔ یہاں ایسے ایسے نام سننے کو ملیں گے کہ بس۔ یہ لوگ پکارنے کے لیے کوئی بھی نام رکھ لیتے ہیں۔ نہ مطلب کھنگالنے کی فکر، نہ مذہب و قوم کا خیال۔ یہاں آنے والے غیر ملکی سیاحوں کے نام پہ بھی یہ اپنے بچوں کے نام رکھ لیتے ہیں۔ ویسے ژان خان شیعہ مسلم ہے۔ یہ کیلاش کے قصبے کا رہنے والا ہے، بمبوریت کی کافر آبادی سے نہیں میں نے کہا ناں یہاں دو تہذیبوں کا میل ہے۔

قصباتی لوگ اکثر تو مسلمان ہی ہیں، سکھ اور اکا دکا ہندو بھی نظر آ جاتے ہیں۔ ان کی زبانیں پشتو کے علاوہ گوجری، کوہستانی اور کشمیری بھی ہیں۔ یہ قدرے تعلیم یافتہ اور تہذیب پسند ہیں، لیکن کالام حقیقی معنی میں کافرستان ہے۔ صدیوں سے چلی آ رہی اپنی تہذیب و تمدن اور مذہب میں یہ رتی بھر تبدیلی کرنے پہ تیار نہیں۔ یہ اپنا مخصوص لباس پہنتے ہیں، اشوجی اور گاروی زبان بولتے ہیں اور اپنی قوم میں کسی انقلاب اور جدت کے سخت خلاف ہیں۔ ہاں

Urdu.com
Urdu Photo

ناموں کے سلسلے میں یہ اُصول کچھ کمزور ہیں۔ یہاں کوئی ڈیوڈ ہے، کوئی رام لعل، کوئی پھول خان ہے تو کوئی گوبھی خان، کوئی سکندر ہے تو کوئی بندر۔"

"ڈونٹ ٹیل می یار۔" میں ہنسنے لگا۔

"ابھی دیکھنا ذرا تم" اس نے گیٹ پہ بیٹھے چوکیدار کو پشتو میں مخاطب کیا۔

"سنگے ایران چاچا؟" (کیسے ہو ایران چاچا؟")

"ہخیر راغلے، ہخیر راغلے۔" (خوش آمدید، خوش آمدید،) وہ اس کے ہاتھ چومتا ہوا مزاج پُرسی کرنے لگا۔

"یہ کمانڈر خان ہے اور یہ اس کا بھائی جرنیل خان۔" اس نے آٹھ سال کی عمر کے دو جڑواں لڑکوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ژان کے بھائی پان خان کے بیٹے ہیں اور یہ ہے مجرے کا نائی، غضب کا فنکار ہاتھ ہے اس کا۔ انجیر نام ہے اور یہ مسٹر جناح بولے کمال کے ڈرائیور ہیں، یہی ہمارے گائیڈ کا کام بھی کریں گے۔"

اس نے فرداً فرداً ان سب دلچسپ ناموں والی ہستیوں کا تعارف کرایا اور ہم مجرے میں چلے آئے۔

رات کے سائے پھیل رہے تھے، لیکن تاریکی اس حسن کو میری نظر سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتی جو صبح کے پہلے اجالے کے ساتھ میرے حواسوں پہ چھانے والا ہے۔

۱۶ مئی ۱۹۸۰ء

وادی کیلاش میں آج صبح کی پہلی کرن کے ساتھ بیدار ہونے والا میں پہلا شخص تھا یا شاید میں تو سورج کے طلوع ہونے سے بھی پہلے ہی مجرے کے کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ نیلگوں تاریکی میں پو پھٹنے تک میں مجرے کے احاطے میں موجود مخملیں گھاس پر ٹہلتا رہا۔ وہاں کی فرحت افزا اور خوشبوؤں بھری فضا کی تازگی اپنے اندر اتارتا رہا۔

فیروز کے سونے کے انداز سے تو ظاہر ہوتا تھا وہ اور دو تین گھنٹے تک جاگنے کے موڈ میں نہیں۔ میں اسے جگاتے جگاتے رہ گیا، یہی کم تھا کہ وہ دوستی اور میزبانی کے تقاضے نبھاتے ہوئے میرے ساتھ یہاں تک چلا آیا تھا۔ اپنے کاروبار اور بیوی بچے کو چھوڑ کر، مجھ جیسے ہر ذمہ داری سے آزاد، بے فکرے سیاح کا ساتھ دینے کے لیے۔ اتنی صبح صبح اس کی نیند خراب کرنے کا ارادہ میں نے ترک کر دیا۔ ایران چاچا بھی شاید رات بھر کی چوکیداری کے بعد اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا۔ دُور دُور تک کوئی ذی رُوح نظر نہیں آ رہا تھا۔

مُرغ کی کڑک دار بانگیں پُرسکون فضا کا سینہ چیرے دے رہی تھیں۔ مرغ کی آواز کے ساتھ ہی مجھے سیدو شریف میں گزاری رات یاد آ گئی۔ جب فیروز خود بھی حلق تک بھنی مرغی ٹھونس رہا تھا اور مجھے بھی بے تحاشا کھانے پہ مجبور کر رہا تھا۔ جب میں نے اسے ٹوکا کہ "کیا آج سے پہلے کبھی مرغی نہیں دیکھی، یا آج کے بعد دیکھنے کو نہیں ملے گی کیا، جو دیگر پکوان چھوڑ کر بے چاری مرغی کی جان کے دشمن بنے ہوئے ہو۔" تو اس نے ایک دلچسپ انکشاف کیا تھا۔

"کیلاش میں باورچی، نائی اور چوکیدار وہاں کی مقامی آبادی کے ہوتے ہیں اور کافرستان کے مذہب میں مرغ حرام ہے۔ اس لیے کسی کیلاش باورچی کے ہاتھ میں مرغ پکانے کے لیے دینا گویا اس کی مذہبی عقیدت پہ وار کرنا ہے اس لیے خوچہ جتنی مرغی کھانی ہے آج ہی کھا لو نجانے اور کتنے ہفتے دُبلے اور پتلیں کھانی پڑیں۔"

اس کا ندیدے پن سے مرغی پہ مرغی اُڑانا یاد کر کے میرے لبوں پہ مسکراہٹ آ گئی۔ دُور کہیں سے فجر کی اذان سنائی دینے پر میں لکڑی کا پھاٹک کھول کے سرمئی پتھروں والی گلی میں آ نکلا۔

سامنے ڈھلان کی جانب سے ایک سیاہ پوش وجود بغل میں گھڑونچی دبائے قدم بہ قدم اُبھر رہا تھا۔ ٹی وی یا میگزینز میں کالام کے اس روایتی لباس اور زیور کے ساتھ کئی بار وہاں کی دوشیزاؤں کو دیکھ رکھا تھا لیکن..... پہلی بار ایک کالاش دوشیزہ کو آتے دیکھ کے میرے قدم خود بخود رک گئے۔ وہ بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتی میرے مقابل آن کھڑی ہوئی۔ ملگجے سے اُجالے اور ہلکی ہلکی دھند میں اس کے نقوش واضح نہ تھے۔ لیکن قد آور سراپا مکمل خود اعتمادی کے ساتھ میرے سامنے تھا۔ اس کے لبوں سے چند نا قابل فہم الفاظ والا ایک جملہ نکلا تھا شاید اس نے اپنی مقامی زبان میں گھڑونچی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا تھا۔ میں احمقوں کی طرح دیکھنے لگا۔ لڑکی سمجھ دار تھی، میرے کچھ کہے بغیر ہی سمجھ گئی اور اب کے پشتو میں مخاطب ہوئی۔

"بکری کا تازہ دودھ ہے صیب، کتنا لو گے؟" اپنی مادری زبان میں اسے بولتے دیکھ کے مجھے عجیب سے احساسات نے آن گھیرا۔ پوری دنیا گھوم چکا تھا میں، مختلف ممالک میں بھانت بھانت کی لڑکیوں سے واسطہ پڑا تھا مجھے، بھنورا صفت یا رنگین مزاج کہنا تو کس طور جائز نہ ہوگا۔ بہر حال صنفِ نازک سے قطعی پرہیز مجھے بھی نہیں رہا۔ اٹلی کی سلویا اور قاہرہ کی نجوا سے میری اچھی خاصی دوستی رہی، لیکن کیا کیا جائے رگوں میں اُبلتے اس خون کی تاثیر کا۔

urdu.com
URDU PHOTO

میرے اندر کا پختون زادہ اپنی فضاؤں میں آ کے پورے کروفر سے سر اُٹھا لیتا تھا۔ اپنی برادری اور خطے کی خواتین کو سامنے پا کے میں کبھی بھی بے تکلفانہ گفتگو نہیں کر سکتا تھا۔

ہمارے خاندان میں فرسٹ کزنز سے بھی عمر کے ایک حصے میں آ کے پردہ کر لیا جاتا ہے۔ حویلی کے زنانہ اور مردانہ حصوں کے ملازمین تک کے سلسلے میں احتیاط کی جاتی ہے۔ جس طرح ہمارے زنان خانے میں مرد ملازم کا جانا محال ہے، اسی طرح بی بی جان مردان خانے اور حجرے میں گھریلو ملازماؤں کا جانا بھی پسند نہیں کرتیں اور اب سحر کی اس اوّلین ساعت میں، دُور دُور تک پھیلے سناٹے اور تنہائی میں ایک لڑکی کو خود سے ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پہ اپنی مادری زبان میں خود سے مخاطب پا کے میں ایک لمحے کے لیے بھول ہی گیا کہ وہ ایک غیر قوم، غیر مذہب لڑکی ہے قصداً ذرا سا ایک جانب ہوتے ہوئے میں نے اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اندر جا کے گھر کی خواتین سے پوچھ لو۔'' اس نے گھرونچی سنبھالتے ہوئے اندر کی طرف قدم بڑھایا اور ایک ٹٹولتی ہوئی مگر سرسری سی نظر مجھ پہ ڈالی۔ غضب کا اعتماد تھا اس کی بے پرواہ چال میں۔ میں آگے بستی کی طرف بڑھ گیا۔ دو گلیاں پرے ایک کچی مسجد میں فجر کی نماز ادا کی اور ٹہلتا ہوا واپس آ گیا۔

ناشتا ژان خان کے گھر کے اندرونی حصے میں ہوا۔ میں گھریلو خواتین کی موجودگی میں کچھ اِن ایزی فیل کرتا رہا، لیکن شاید ژان کی ماں، بہنیں وغیرہ سب فیروز سے خاصی بے تکلف تھیں۔ وہ پشتو نہیں جانتی تھیں اور میں ان کی زبان سے نابلد، البتہ فیروز ٹوٹے پھوٹے الفاظ، کچھ ہاتھ کے اشاروں کے ذریعے اور کچھ ژان کے بھتیجوں کمانڈر اور جرنیل کی مدد سے مسلسل شاملِ گفتگو رہا۔ ناشتے کے دوران کیلاش ملازمین [illegible] دسترخوان بچھانے، کوئی گرم روٹی پیش کرنے۔ ایک وہیں بیٹھی پھل کاٹ رہی تھی۔ اور دو چار نوعمر لڑکیاں کونے میں لگیں کھسر پھسر اور کھی کھی کر رہی تھیں اور فیروز کے فقروں پہ کھلکھلاتی رہی تھیں۔ اس نے میرا گریز بھانپ کے مجھے گفتگو میں شریک کرنا چاہا۔

''یار! زریاب تو ان کے نام نہیں پوچھے گا۔ ذرا دیکھ تو سہی حسن و شباب کے ان شاہکاروں پہ لیبل کیا کیا لگے ہوئے ہیں۔'' میں نے مسکرا کے ٹالنا چاہا، مجھے خواتین کو یوں تحقیر بھرے انداز میں موضوعِ گفتگو بنانا پسند نہ تھا پھر چاہے وہ کوئی اَن پڑھ، گھریلو ملازمہ یا کافر پہاڑن ہی کیوں نہ ہو، لیکن شاید وہ لوگ بھی ان دوشیزاؤں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کے عادی

تھے اور وہ بھی ان صاحب لوگوں کے ساتھ خاصی کھلی ہوئی لگ رہی تھیں۔

''یہ دیکھو سب سے پہلے تمہارا تعارف ''غٹ شنڈے'' سے کراتا ہوں۔'' اس نام پہ میں نے بے ساختہ سر اٹھا کے سامنے دیکھا اور اس مسکراتی ہوئی اُجڈ سی لڑکی کو دیکھ کے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کر سکا۔ جس نے بھی یہ نام رکھا تھا بڑا ہی ''برجستہ'' رکھا تھا۔ اس کے چہرے پہ کوئی چیز اگر نمایاں تھی تو وہ عنابی رنگ کے خاصے بڑے بڑے ہونٹ تھے جو پیلے دانتوں کو خاصی حد تک ڈھانپے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں بلاشبہ بے حد شفاف اور معصوم سی تھیں لیکن لمبے لمبے پیلے دانتوں اور موٹے لٹکے ہوئے ہونٹوں کا کمبی نیشن اس کی آنکھوں کا حسن غارت کر رہا تھا۔ ''غٹ'' پشتو میں بڑا کو اور ''شنڈے'' ہونٹ کو کہا جاتا ہے یقیناً کسی پشتو دان نے اسے یہ نام دیا ہوگا اور اس کے ماں باپ نے بغیر مطلب جانے اسے تمغے کی طرح اس بے چاری پہ سجا دیا۔

''اور یہ ہیں مس لندن'' اس نے بارہ تیرہ برس کی دبلی پتلی سی شرمیلی بچی کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور ایک مس پیرس بھی ہوتی ہیں وہ آج اتفاقاً غیر حاضر ہیں۔ یہ نام یہاں آنے والے غیر ملکی سیاحوں سے متاثر ہو کر رکھے گئے ہوں گے۔ بے تکلف ہونے میں تو یہ کوئی کمال رکھتی ہے۔ بنا زبان سمجھے جانے یہ ہر ملک سے آنے والے لوگوں سے گھل مل جاتے ہیں۔ انہیں اپنی تقریبات میں مدعو کرتے ہیں اور بدلے میں اور کچھ نہیں تو ان کے [illegible] نام تو مل ہی جاتے ہیں اور یہ..... یہ دیکھو۔''

اس نے [illegible] موٹی غلافی آنکھوں، بھرے بھرے گالوں اور سونے کی سی رنگت والی ایک دو سالہ بچی کی انگلی تھام کے آگے کیا۔

کیا اسے دیکھ کے قدرت کی فیاضی پہ ایمان لانے کو جی نہیں چاہتا؟ لیکن جانتے ہو اس کا نام کیا ہے؟ غریبی'' میں نے نظر بھر کے اس بچی کو دیکھا۔ کون سا رنگ تھا فطرت کا جو خدا نے اس کے چہرے پہ سجا نہیں دیا تھا۔ سبز آنکھیں، گلابی ڈورے، سرخ گال، مرمریں ہونٹ، بھورے بال، سنہری جلد اور نام غریبی میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔ میں نے جیب سے ایک پانچ سو کا نوٹ نکال کے بچی کے مٹی سے سنے ہاتھ میں تھمایا اور کہا۔

''اس کا نام ''انمول'' ہے۔ اس کی ماں سے کہہ دینا۔'' اور اُٹھ کے باہر نکل آیا۔ کنویں کے پاس ''کچے'' میں ایک اور سیاہ پوش لڑکی پیتل کی گھرونچی کھنگال رہی تھی مجھے یونہی شبہ سا ہوا کہ یہ وہی صبح والی لڑکی ہے۔ ذرا قریب جا کے میرا شبہ یقین میں بدل گیا۔ اگرچہ صبح کے

urdu.com
Sabaa URDU PHOTO

دھندلکے میں اس کے نقوش نہیں دیکھ پایا تھا لیکن مدھم سُروں میں گنگناتی اس کی آواز میں فوراً پہچان گیا۔ میرا ارادہ احاطے سے گزر کر سامنے ایران چاچا کے پاس جا کے گپ شپ لگانے کا تھا کہ وہ واحد ملازم تھے جو پشتو بول سکتے تھے، لیکن نجانے کیوں میرے قدم اس کے قریب آ کے رک گئے۔

''اور تمہارا نام کیا ہے؟'' اچانک میں نے اپنی آواز سنی۔ اس نے ذرا سا سر اُونچا کر کے نظر مجھ پہ ڈالی۔ گھڑونچی سے پانی جھاڑا، گیلے ہاتھ اپنے گھیر دار کرتے سے پونچھتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''مومنہ علی'' پُر اعتماد لہجے میں جواب دیتی ہوئی وہ آگے کو قدم بڑھا گئی اور میں جو کسی عجیب و غریب نام کا منتظر تھا۔ مومنہ علی سُن کے دنگ رہ گیا اور جہاں کا تہاں کھڑا اس نام پہ غور کرتا رہا۔

''کیا ہوا؟ کہاں گم ہو؟'' فیروز میرے نزدیک چلا آیا۔

''کچھ نہیں، یار مذاق سے قطع نظر یہ لوگ واقعی نام رکھنے کے سلسلے میں بہت لاپرواہ لگتے ہیں۔'' میں بڑبڑایا۔

☆☆☆

''مومنہ علی''

مقدس کی نظریں پھر سے دو سطریں اوپر پھسل کر ''مومنہ علی'' پہ ٹھہر گئیں۔ اس نے زیر لب یہ نام دہرایا۔

''اللہ اکبر..... اللہ اکبر''

فجر کی اذان کی آواز ماحول کے ہر احساس پہ حاوی ہو گئی۔

اسے شروع ہی سے صبح صادق کے ملگجے اُجالے میں اذان سننا بے حد اچھا لگتا تھا۔ بابا جان کو بھی تو وہ..... مومنہ علی فجر کی اذان کے سے..... اور اب مجھے بھی، اس وقت اس کی ذہنی رو بھٹک کر پھر وہیں چلی گئی تو سر جھٹک کے وضو کو نے کھڑی ہو گئی۔ نماز ادا کر کے اس نے دُعا کے لیے ہاتھ بلند کیے۔ آج سے پہلے اس نے خود کو کبھی اتنا تہی دست نہ محسوس کیا تھا، یہاں تک کہ دُعا مانگنے کے لیے اس کے کشکول میں الفاظ کے سکے بھی نہ تھے۔ وہ کیا مانگتی۔

ماں باپ کی سلامتی اور ان کی لمبی عمر کی دعا۔

یا۔

پھر ان کی مغفرت کے لیے۔

''نہیں، نہیں۔'' وہ لرز گئی۔ ''یا اللہ میں نہیں جانتی میرے ماں باپ کہاں ہیں اور کیوں ہیں، وہ کیا وجہ ہے جس نے انہیں مجھ سے غافل ہو کر اپنی اپنی زندگی الگ الگ گزارنے پہ مجبور کر دیا ہے۔ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ مجھے ان سے لاعلم رکھنے میں تیری کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔ لیکن یا مسبب الاسباب مجھے ایک بار صرف ایک بار ان سے ملوا دے۔ میں ایک بار..... زندگی میں صرف ایک بار ان کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھنا چاہتی ہوں، ایک بار ماں کی آغوش کی گرمی محسوس کرنا چاہتی ہوں، ایک بار اپنے سر پہ باپ کے ہاتھ کا سایہ محسوس کرنا چاہتی ہوں۔

میں جاننا چاہتی ہوں وہ ٹھنڈک کیسی ہوگی جو ان ہاتھوں تلے پھیلی چھاؤں میں ہے۔ میں جاننا چاہتی ہوں وہ گرمی کتنی پر سکون ہوگی جو ماں کی پھیلی ہوئی بانہوں کی پناہ میں ہے۔ میں جاننا چاہتی ہوں کپکپاتے لبوں کا وہ بوسہ کتنا حیات بخش ہوتا ہوگا جو اولاد کے ماتھے کا مقدر بنتا ہے۔ یا اللہ تُو تو سب جانتا ہے..... کیا میرے ماتھے کے نصیب میں وہ بوسہ ہے؟ یا اللہ رحیم و کریم پروردگار بس ایک بوسہ ذرا سی گرمی تھوڑی سی چھاؤں میرے نصیب میں بھی۔''

رات بھر کی جاگی آنکھیں خدا کے حضور گریہ زاری کے بعد اتنی متورم ہو گئیں کہ اسے انہیں [illegible] چند سیکنڈ کھولے رکھنا بھی دشوار ہو گیا۔ دل میں برسوں سے دبی خواہشوں کو جب [illegible] ذریعے [illegible] ملا تو رُوح تک شانت ہو گئی۔ اس نے مُندی آنکھوں کو کھولنے کی کوشش [illegible] نماز کا ہی ایک کونا موڑ کے اس پہ بے سدھ ہو گئی۔

''نیم..... ہیلو گرین ویک اپ.....''

شناور نجانے کب سے اسے آوازیں دے رہی تھی۔ اس نے پلکیں کھولنے کی کوشش کی۔ سُوجی سُوجی آنکھوں سے گھٹنوں کے بل کارپٹ پہ بیٹھی شناور کو خود پہ تشویش سے جھکے پایا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے نیم غنودگی کے عالم میں تکتی کچھ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

''اُٹھیے محترمہ، گیارہ بج رہے ہیں..... بہت سو لیا۔ اس طرح راتیں جاگ جاگ کے اور دوپہر چڑھے تک سونے کی عادتیں پکی کر لیں تو بڑی پرابلم ہو جائے گی۔ واپس تو ہاسٹل میں جانا ہے ناں، اب چھٹیاں ہی کتنی باقی رہ گئی ہیں۔''

urdu.com
URDU PHOTO

اس کے اتنا کہنے پہ مقدس کو یہ یاد آیا کہ وہ ہاسٹل کے کمرے میں نہیں بلکہ پشاور میں موجود ہے۔ اس نے بازوؤں پہ رکھا سر اٹھا کے اُٹھنے کی کوشش کی تو کراہ نکل گئی۔ کئی گھنٹے ایک ہی پوزیشن میں سونے کی وجہ سے گردن اور شانے کے پٹھے کھنچ سے گئے تھے اور کلائیوں تک ہاتھ سُن ہو چکے تھے۔ نماز کی چادر اسی طرح سر کے گرد لپٹی تھی اور یہ کمبل..... یہ یقیناً شانو نے ہی اُوڑھایا ہوگا۔ وہ مسکرائی۔

"سنو، کچھ خاص بات پتہ چلی ڈائری سے۔" اسے کھڑکی کے پاس روشن دُھوپ میں قدرے ہشاش انداز میں کھڑا دیکھ کے شناور نے پوچھا۔

"ابھی تک تو نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بیڈ پہ آ کے بیٹھ گئی۔ "میرا خیال ہے میں نے فضول اتنے گھنٹے برباد کیے۔ یہ تو ڈائری کم اور کوئی سفرنامہ زیادہ لگ رہا ہے۔"

"وہاں اور بھی تو ڈائریاں ہوں گی۔"

"ہاں لیکن مجھے یہ اس لیے متوجہ کر گئی کہ ایک تو یہ میری پیدائش سے ایک ڈیڑھ سال ہی پرانی ہے، یعنی تقریباً اس دور کی جب بابا جان نے میری ممانے سے شادی کی ہوگی یا کرنے والے ہوں گے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ ان کے ہاتھ کی لکھی اب تک کی آخری ڈائری ہے اس لیے میں نے سوچا تھا کہ اس میں لکھے حالات و واقعات ضرور ان حقائق سے پردہ اُٹھا دیں گے جو اب تک میری نظر سے مخفی ہیں، یا رکھے گئے ہیں لیکن....."

اس نے ڈائری کے اوراق بے دلی سے پلٹے۔

"اس میں تو سوات، کالام اور نجانے کن کن وادیوں کے قصیدے لکھے ہوئے ہیں۔ کُہساروں، آبشاروں، ندی نالوں کے تذکرے وغیرہ وغیرہ۔" اس کے لہجے میں مایوسی تھی جسے جھٹک کے وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔

"ویسے ایک بات ہے یار..... بابا جان میں ایک اچھا رائٹر بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ جو بات میں جاننا چاہتی تھی اس کا اس ساری تحریر سے کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود میں کس طرح گھنٹوں اس کے مطالعے میں مصروف رہی یہ میں بھی نہیں جانتی۔ انہیں تو مصور ہونے کے بجائے مصنف ہونا چاہیے تھا۔"

"تمہارے بابا جان آرٹسٹ ہیں اور آرٹ کے کسی بھی ایک شعبے سے تعلق رکھنے والا شخص دوسرے فنون لطیفہ سے نابلد نہیں رہ سکتا۔ میں نے ماموں کے پینٹ کیے ہوئے لینڈ اسکیپ بھی دیکھے ہیں اور وہ خوب صورت لمحات بھی جو انہوں نے کیمرے کی آنکھ سے قید

کیے ہیں اور یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ انہیں خوب صورتی اور وہ بھی فطری خوب صورتی بہت اٹریکٹ کرتی ہے۔ لازمی سی بات ہے کہ اس کا اظہار ان کی تحریر میں بھی ہوتا ہوگا۔ جس خوب صورتی کو وہ موقلم کے ذریعے نہ اُبھار سکتے ہوں گے اسے قلم کے ذریعے خراجِ تحسین پیش کرتے ہوں گے، لیکن تم یہ باتیں کیا جانو..... اِک آرٹسٹ کی فیلنگز دوسرا آرٹسٹ ہی جان سکتا ہے۔" اس نے شوخی دکھائی۔

"اچھا اب یہ فن اور فنکاری چھوڑو اور میرے لیے کچھ ناشتے کا بندوبست کرو۔ سخت بھوک لگی ہے۔"

"بہت اچھے..... مقدس خانم بہت اچھے..... مجھے کیا اپنی کنیز خاص سمجھ رکھا ہے۔ رات کو تمہاری دگرگوں حالت پہ رحم کرتے ہوئے کافی کا کپ کیا لا تھمایا اور صبح یہاں کارپٹ پہ سکڑے سمٹے دیکھ کے کمبل کیا اوڑھا دیا تم نے مجھے اپنی خادمہ ہی تصور کر لیا۔ چلو اُٹھو خانم..... اور اپنی پیٹ پوجا کا انتظام خود کرو، مجھے آج یہ نوٹس مکمل کرنے ہیں۔" وہ اسے جھاڑتی پھر سے فائل پھیلا کے بیٹھ گئی۔ اسے جب ہی مقدس کو تاؤ دلانا ہوتا وہ اسے "خانم" کہہ کے چھیڑتی۔ لیکن آج چڑنے کے بجائے وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی تو شناور نے مڑ کے اسے دیکھا۔ اور کچھ کہتے کہتے رہ گئی۔ رات وہ جس حالت میں کمرے میں آئی تھی وہ حالت ایسی ہرگز نہیں تھی کہ اس کے سنبھلنے میں اتنا کم وقت لگتا۔

"لیکن اگر وہ خود کو نارمل ظاہر کرنے کے لیے اتنی فریش نظر آ رہی ہے تو مجھے بھی اپنے تجسس کو فی الحال جھٹک دینا چاہیے۔ کیا پتہ میرے استفسار پہ وہ پھر سے بکھر جائے اور [illegible] تک وہ خود نہ بتانا چاہے گی میرے پوچھنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ کل بابا جان کے [illegible] کیا ہوا تھا۔" اس نے رات سے وسوسوں، اندیشوں اور سوالوں سے گھرے دل کو [illegible] نے کہے باز رکھا۔

ناشتے کی ٹرے لے کے کچن سے نکلتے ہوئے اس کی نظر بابا جان کے کمرے کی طرف اُٹھی اور اس کے قدم تھم گئے۔ ذہن پھر سے اس بند کمرے میں ہونے والی پُر پیچ گفتگو کی طرف چلا گیا۔ اسی لیے وہ نیچے آنے سے کترا رہی تھی۔ وہ کم از کم آج کے دن پھر سے اپنے دل و دماغ کو اس پہیلی میں نہیں اُلجھانا چاہتی تھی۔ وہ دل و دماغ جو خدا کے حضور اپنا مقدمہ پیش کر کے سبک سے تھے۔ اس نے بدقت قدم اُٹھائے اور سیڑھیوں کی جانب بڑھی۔

"آپ کچھ بھی کہیں بی بی جان، بابا جان، اچھا نہیں کر رہے۔ انہیں اور کچھ نہیں تو

urdu.com
URDU PHOTO

دراب کی کم از کم یہ بات تو مان لینا چاہیے کہ وہ زریاب کے آنے تک اپنا فیصلہ ملتوی کر دیں۔ اب تو وہ آنے ہی والے ہوں گے، نطاشہ کے بابا کا تو یہی کہنا ہے۔" چچی جان کے کمرے سے آتی تائی جان کی دبنگ مگر جھنجھلائی آواز نے اسے پھر سے رُک جانے پہ مجبور کیا۔

"اللہ کرے، ایسا ہی ہو..... زریاب بچہ ساتھ خیریت کے اپنے گھر لوٹے اور..... اور..... سب ٹھیک ہو جائے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو ہی جائے گا..... سب ٹھیک جائے گا۔" بی بی جان کی متفکر آواز سنائی دی۔

اللہ کرے....." تائی جان نے تائید بھرا ہنکارا لیا پھر دبے لفظوں میں کہنے لگیں۔

"ویسے میں نے سُنا ہے مردوں سے کہ زریاب کو یہاں آنے میں خطرہ ہی خطرہ ہے، وہ سو سال بعد بھی آئے تو فیروز خان کے لوگ اسے زندہ تو چھوڑیں گے نہیں۔"

"اللہ نہ کرے..... خیر کی بات کرو گل بی بی..... خیر مانگو خدا سے۔" بی بی جان نے دل کے انہیں گھر کا اور وہ جو خود کو ان سب مذاکرات سے بے نیاز ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے آگے بڑھنے پہ آمادہ کر رہی تھی۔ فیروز خان کے نام پہ سر تا پا ہل کے رہ گئی۔

فیروز خان..... فیروز خان وردگ..... یہ تو وہی بابا جان کے سوات والے دوست ہیں جن کا تذکرہ ڈائری میں ہے۔ اس نے تمام حواس مجتمع کر کے دروازے کے پیچھے سے آنے والی آوازوں کی طرف متوجہ کیے۔

"میں تو یونہی ایک بات....." تائی جان منمنائیں

"پھر بھی گل بھابھی آپ کو سوچ سمجھ کے بات کرنی چاہیے۔" چچی جان کے لہجے میں خفگی تھی۔

بی بی جان کی دبی دبی سسکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔ یہاں بھی خطرہ ہی خطرہ ہے۔ یہ وردگ بھی ہماری طرح دشمن دار لوگ ہیں۔ نسلوں تک بدلے کا زہر ان کے ذہن سے نہیں اُترتا۔ اللہ میرے بچے کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ کیا اب میں اس کے یہاں آنے کی دُعا بھی نہ کروں؟" بی بی جان کا پگھلتا اور بھیگا لہجہ اس کے لیے نئی چیز تھا۔ وہ بھاری ہوتے وجود کو آگے گھسیٹ لے گئی۔

فیروز خان وردگ بابا جان کا عزیز تر دوست یا خون کا پیاسا دشمن۔ اس سوال کے جواب کی طلب نے اسے ایک بار پھر وہی ڈائری کھولنے پہ مجبور کر دیا۔

☆☆☆

۱۷ مئی ۱۹۸۰ء

مئی کا مہینہ یہاں کا سب سے خوش گوار مہینہ ہے اور اسی مہینے میں وہ جشن بہاراں منایا جاتا ہے جس کی اکثر جھلکیاں ٹی وی پروگرامز میں دکھائی جاتی ہیں۔ آگ کا بڑا سا الاؤ جس کے گرد خوشی سے دمکتے چہروں کا سادہ مگر منظم رقص۔ جب فیروز نے بتایا کہ ہم لوگ بھی کل رات ہونے والے اس جشن میں مدعو ہیں تو میں بے حد پُر جوش ہو گیا۔ آج صبح ہی فیروز مجھ سے اجازت لے کر ایک دن کے لیے آگے کسی قصبے میں اپنے والد کے کسی دوست کی عیادت کے لیے چلا گیا۔ مجھے اور تو کیا اعتراض ہو سکتا تھا، لیکن میں نے اسے کل تک ہر حال میں واپس لوٹنے کی تاکید کی۔ میں جشن میں اس کے بغیر شرکت نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اس کے حوالے سے، اس کے مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا۔

آج کا سارا دن میں نے بمبوریت کے اُونچے نیچے راستوں پہ بھٹکتے ہوئے گزارا، ایران چاچا میرے ہمراہ تھا۔ میں نے وہاں کا روایتی قبرستان بھی دیکھا۔ ایک کھلا سا میدان جس میں ٹوٹی ہوئی چارپائیاں، شکستہ استخواں اور پُرزہ پُرزہ ہوئے تابوت ہیبت ناک ماحول پیدا کر رہے تھے۔ ایران چاچا بتانے لگا۔

"یوں تو ہمارے ہاں مُردے کو تمام آخری رسومات ادا کرنے کے بعد چارپائی سمیت یہاں ڈال دیتے ہیں، لیکن کچھ صاحب حیثیت لوگ اب تابوت بھی بنانے لگے ہیں، مردے کے ساتھ اس کی اپنی حیثیت کے مطابق خوراک بھی رکھی جاتی ہے۔ فرشتے جب مُردے کے پاس آتے ہیں تو وہ ان کی تواضع کے لیے یہ خوراک پیش کرتا ہے۔"

جنگلی جانوروں، چیلوں اور گِدھوں کی نوچ کھسوٹ اور بربریت کی نشانیاں وہاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے جھرجھری لی اور آگے چل پڑا۔

عورتوں کے ٹولے کے ٹولے روٹیوں کی چنگیریں اُٹھائے، سر پہ پھل کے ٹوکرے رکھے، جنگل کی طرف نکل رہے تھے۔

"چاچا تم تو کہہ رہے تھے جنگل کے اندر کا حصہ بہت خطرناک ہے، ہر طرح کا زہریلا سانپ اور خونخوار جانور اندر موجود ہے، پھر یہ عورتیں پکنک منانے وہاں کیوں جا رہی ہیں۔" میرے سوال پہ چاچا الجھا۔

"پن، کک؟ وہ کیا بلا ہے؟..... بچہ یہ تو ملوش دیوتا کی خدمت میں کھانا پیش کرنے جا رہی ہیں۔ کل تہوار ہے ناں، ہر تہوار میں دیوتا کی دعوت کے لیے کھانا جنگل میں پھینک دیا

urdu.com
URDU PHOTO

جاتا ہے۔"

"بڑے پیڈو دیوتا ہیں تمہارے۔" میں بڑبڑایا۔

"وہ دیکھو، تمہارا قبر۔"

میں ایک شفاف جھیل کے کنارے اُونچے سے پتھر پہ بیٹھا ٹھنڈے پانی سے وضو کر رہا تھا جب چاچا کی پاٹ دار آواز پہ چکنے پتھر سے پھسلتے پھسلتے بچا۔ میں نے مُڑ کے اسے دیکھا، شاید اس کے دیوتا کی شان میں گستاخی کرنے کی پاداش میں میرا قتل کا منصوبہ تیار ہو گیا ہو، لیکن اس کے تاثرات نارمل ہی تھے۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں میں نے ذرا سا اچک کے دیکھا۔ کچھ فاصلے پر..... چناروں کے سائے میں ایک اکیلی قبر تھی۔ قبر کچی تھی مگر اس کے گرد پتھر لگا کے گویا حد بندی کر دی گئی تھی، اُوپر چکنی مٹی کا لیپ بھی تھا۔

"اوہ۔" اب میں سمجھا۔ کسی مسلمان کی قبر تھی جسے وہ میری قبر بنا رہا تھا۔

"تمہیں اللہ سمجھے چاچا۔" میں نے خفگی سے اسے گھورا اور دوبارہ سے وضو کرنے لگا۔

اس حسین وادی کے سرسبز قطعے پہ پھولوں بھری سرزمین پہ سجدہ ادا کرتے ہوئے کچھ عجیب سا لطف اور سکون محسوس ہوا۔ یہ سچ ہے کہ فطرت آپ کو خدا سے اور قریب کر دیتی ہے۔ چہرے کو چھو کے گزرتی بدلیاں بدن میں جھرجھری پیدا کر دیتی ہیں۔ سلام پھیرتے ہوئے میری نظر پھر اس قبر پہ پڑی نجانے میرے دل میں کیا آیا کہ چند لمحوں بعد میں اس قبر کے سرہانے کھڑا فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ بڑھ کے ایک بڑا سا گیندے کا پھول توڑا اور اس کی پتیاں قبر کے سرہانے پھیلا دیں۔ واپس پلٹتے ہوئے ایک سرشاری کی کیفیت مجھ پہ چھائی ہوئی تھی۔

۱۸ مئی ۱۹۸۰ء

مجھ سے وعدہ کرنے کے باوجود فیروز آج نہیں لوٹا۔ میں سخت جھنجلایا ہوا تھا۔ صبح اس جشن کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے کیمرے میں قید کرنے کے لیے بے چین تھا اور اب فیروز غائب تھا۔ موسم کی خرابی مجھے اس کی بے بسی کا یقین دلا رہی تھی کہ یقیناً سارا دن چلتی تیز آندھیاں اسے سفر کرنے سے روکتی ہوں گی اور شام کے بعد تو ان علاقوں میں سفر کرنا یوں بھی ناممکن ہوتا ہے۔ پھر بھی مجھے رہ رہ کے اس پہ غصہ آ رہا تھا۔

میں اُکتایا ہوا سا چارپائی پہ سیدھا لیٹا چھت کی کڑیاں گن رہا تھا۔ ساتھ ساتھ اپنی حس سماعت اور حس شامہ سے کام لیتے ہوئے کڑھ کڑھ کر وادی میں ہونے والے جشن کی گہما گہمی محسوس کر رہا تھا۔ کھلی کھڑکی سے اُونچے اُونچے سُروں میں اجنبی زبان والے گیتوں کی مدھم

مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ الاؤ کا دھواں فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ جلتی لکڑیوں کی کڑوی خوشبو، چاول دم لگنے کی اشتہا انگیز مہک کے ساتھ ساتھ چربی پگھلنے کی ناگوار سی بدبو بھی آ رہی تھی۔ اچانک کمرے کے دروازے پہ زوردار دستک ہوئی یہ اچانک اور زوردار دستک ایران چاچا کی مخصوص تھی۔ میں نے بے دلی سے اسے اندر آنے کو کہا۔ اس کے ساتھ ساتھ چند اور مقامی لوگ بھی زور زور سے بولتے چلے آئے۔

میں پھرتی سے اُٹھ بیٹھا۔ ان کے انداز سے خفگی اور اپنائیت بیک وقت عیاں تھی۔ ایران چاچا نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"صیب، یہ لوگ بہت سخت خفا ہیں۔ تم نے ان کی دعوت کو قابل توجہ نہیں سمجھا، اس لیے تم صرف فیروز خان صیب کے مہمان نہیں پوری وادی کے مہمان ہو اور وادی کا کوئی مہمان یوں اکیلا پڑا ہو تو کیا خاک تہوار ہوگا۔ بھلا کیا جشن منائیں گے ہم لوگ۔ خان صیب نہیں تو کیا ہوا تم ہم لوگ کے ساتھ چلو، اگر کوئی کسر رہ گئی تمہاری خاطر میں تو فیروز خان صیب سے کہہ کر سو جوتیاں لگوا لینا۔"

اس کے استحقاق پہ میں مسکرا دیا اور مزید نخرے نہ کرتے ہوئے ان کے ہمراہ چل پڑا۔

پوری کیلاش عوام اس وقت ایک کھلے سے میدان میں جمع تھی۔ بچے، بوڑھے، جوان سب اپنے اپنے ٹولے بنائے بیٹھے تھے۔ ایک طرف چند بزرگ خواتین برتن نما ساز بجا بجا کے کافی [illegible] دازوں میں گیت گا رہی تھیں اور الاؤ کے گرد بیس بیس مرد و زن کی ٹولی دائرہ بنا کے رقص کر رہی تھی۔ کچھ کچھ دیر بعد ٹولی کے ارکان بدل جاتے تھے۔

میں دلچسپی سے ان سادہ چہروں پہ پھیلے مسرت کے عکس دیکھ بھی رہا تھا اور اپنے کیمرے میں [illegible] مختلف زاویے قید بھی کر چکا تھا۔ میری توجہ رقص سے زیادہ ان کے چہروں پہ تھی۔ [illegible] چہرے میں کے کہیں اور کہیں دیکھے تھے۔ جو دل میں وہی چہرے کے خدوخال سے ظاہر ہوتا تھا اور اس وقت ہر چہرے پہ صرف ایک ہی چہرہ جھلملا رہا تھا اور وہ تھا خوشی کا ..... محبت کا..... میری محویت کو ایک مترنم آواز نے توڑا۔

"صیب..... میں۔" میں نے مڑ کے دائیں جانب دیکھا۔ میرے ساتھ بیٹھے ژان خان اور اس کے ساتھیوں کو ان کے کیلاش دوست رقص کے لیے لے جا چکے تھے اور اس وقت میرے دائیں طرف وہی عجیب سے نام والی لڑکی بیٹھی تھی جو میری مادری زبان بڑی روانی کے ساتھ بولتی تھی۔

urdu.com
URDU PHOTO

"تم..... وہی ہوناں..... مریم علی۔" میں نے ذہن پہ زور ڈالا۔

"نہیں، مومنہ علی..... مومنہ علی ہے میرا نام۔" وہ ذرا سا مسکرائی تو قندھاری انار کے رنگ والے اس کے گداز لبوں سے موتی جیسے چمکیلے خوب صورت دانتوں نے لشکارا مار کے جیسے روشنی سی میرے اطراف بھر دی۔ الاؤ کی کئی فٹ اونچی ہوتی آگ کی روشنی بھی مدھم سی پڑ گئی۔ میں مسحور ہو گیا، تب میں نے پہلی بار اس کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اس کی ہلکی بھوری زلفیں وہاں کی روایتی عورتوں کی طرح مینڈھیوں کی صورت سختی اور صفائی سے گندھی تھیں، ماتھے اور رُخسار پہ بھرے تل گودے تھے۔ اس کی آنکھیں یہاں کے لوگوں جیسی سبز یا نیلی نہیں تھیں، بلکہ بھوری..... نہیں..... قرمزی یا شاید شہد..... ہاں شہد جیسا ہی رنگ تھا اور ان شہد کے قطروں کے گرد پھیلی وہ لالی جیسے شفق..... پتہ نہیں کب تک میں خود کو بھلائے ان آنکھوں کا رنگ دریافت کرنے کی کوشش کرتا رہتا کہ وہ پھر سے گویا ہوئی۔

"میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی صیب وہ تم ہی تھے جس نے کل میرے ابا کی قبر پہ فاتحہ پڑھی تھی۔ میں نے دور سے دیکھ کے بھی تمہیں پہچان لیا تھا۔ میرے دور کے آنے کے باوجود تم وہاں سے جا چکے تھے۔ برسوں سے سوائے میرے اس قبر پہ کسی اور نے فاتحہ نہیں پڑھی۔ اللہ تمہیں بڑا اجر دے گا، تم نے ایک اجنبی شخص کے لیے دعا کی۔" وہ آبدیدہ ہو گئی تو میں بے چین ہو اُٹھا۔ نمکین پانی کی یہ بوندیں کہیں شہد میں نہ مل جائیں۔

"وہ تمہارے والد تھے۔ میرا مطلب ہے تم تو....."

میں نے اس کے سیاہ لباس، سر پہ روایتی ٹوپی، اس پہ ٹنگی سیپیاں اور موتیوں کو بغور دیکھا۔ وہ فوراً بولی۔

"الحمدللہ میں مسلمان ہوں اور ایک مسلمان باپ کی بیٹی ہوں۔ میرے ابا کا نام محمد علی تھا اور انہوں نے ہی مجھے مومنہ کا نام دیا، تاکہ میرے نام سے ہی یہ ظاہر ہو جائے کہ میں کون ہوں۔"

"اوہ.....!" میں نے سر ہلایا، اب اسے کیا بتاتا کہ اس کا نام جاننے کے بعد بھی میں یہی سمجھتا رہا کہ کسی کم فہم نے بغیر مطلب جانے یونہی ایک خالص مسلم نام ایک کافر لڑکی کو دے رکھا ہے، بلکہ اس وقت تو مجھے اس انجانے شخص پہ غصہ بھی آیا تھا جس نے میری دانست میں یہ نامعقول حرکت کی ہوگی۔ لیکن اب یہ جان کر کہ وہ ایک مسلمان شخص کی مسلمان بیٹی ہے، مجھے طمانیت سی محسوس ہوئی اور وہ گھبراہٹ جو اسے اپنے قریب پا کے مجھ پہ طاری ہو گئی

تھی، پل میں زائل ہو گئی۔

میں پھر سے جشن کی طرف متوجہ ہو گیا، اسے شاید کچھ اور بھی کہنا تھا، جب ہی بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ بار بار مجھے دیکھتی لیکن میرے اس کی طرف دوبارہ پلٹ کے نہ دیکھنے پہ چپ رہ جاتی۔ آخر میں نے دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا۔

"تو تم رقص میں بھی اس لیے شریک نہیں ہو رہیں۔ لیکن یہاں ژان خان، اس کے علاقے کے دوسرے بہت سے لوگ تو یہ جشن پورے جوش و خروش سے منا رہے ہیں اور تم تو پھر بھی یہاں کی رہنے والی ہو، انہی لوگوں میں سے ایک ہو، وہی لباس پہنتی ہو، وہی زبان بولتی ہو، پھر اس موقع پہ سب سے الگ تھلگ کیوں ہو؟"۔

"نہیں سوائے مذاہب کے میں نے کبھی خود کو ان لوگوں سے الگ محسوس نہیں کیا، نہ میں نے، نہ میرے ابا نے، اصل میں میری ماں کیلاش تھی۔ اس لحاظ سے یہاں موجود بہت سے لوگوں سے میرا خونی رشتہ بھی ہے۔ ایک غیر قوم، غیر مذہب کے شخص کی اولاد ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی مجھ سے غیریت نہیں برتی بلکہ پندرہ سال پہلے مرنے والی میری ماں کے حوالے سے آج بھی مجھے اپنا عزیز جانتے ہیں تو میں اپنی ماں کے حوالے سے انہیں اپنا کیوں نہ سمجھوں۔ ابا نے بھی تو یہی کہا تھا۔ میری ماں کے عشق نے انہیں ہر اس چیز سے عشق کرنے پہ مجبور کر دیا جو میری ماں سے متعلق تھا۔ یہاں کے لوگ، یہاں کی زبان، یہاں کے گیت، یہاں کے پہاڑ، ندی، نالے، یہاں کا چپہ چپہ انہیں عزیز تھا جہاں جہاں میری ماں نے قدم رکھا ہوگا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"وہ بڑے اہتمام سے اس رقص میں شامل ہوتے تھے۔ مجھے اپنے ابا کا ماں کے ساتھ اس جشن میں آخری رقص آج تک یاد ہے۔ تب میں پانچ چھ برس کی تھی۔ یہی مقام تھا، یہی گیت فضاؤں میں گونج رہے تھے۔ اتنی ہی روشن آگ تھی ایسا ہی ستاروں بھرا آسمان تھا۔"

وہ کسی طلسم کے سے عالم میں الاؤ پہ نگاہیں جمائے ساکت بیٹھی تھی، صرف اس کے لب نامحسوس سی حرکت کر رہے تھے نہایت مدھم آواز میں کہے گئے اس کے الفاظ مجھے جکڑ رہے تھے۔

"میری ماں کا پورا وجود دمک رہا تھا، ابا کی نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹ نہ رہی تھیں۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے وہ دائرے میں رقص کر رہے تھے۔ میں یہاں اپنی نانی کی گود میں بیٹھی انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی، اچانک ابا کا ایک قدم ذرا آگے پڑ گیا۔ سنبھلتے

URDU PHOTO

سنبھلتے بھی اس کا ہاتھ ماں کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور..... اور ماں..... وہ بُت بنی کھڑی رہ گئی۔ سب لوگ حیرت کے عالم میں اسے دیکھنے لگے۔ کچھ شاید بات سمجھ گئے تھے اور کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک میری ماں نے.....''

اس کے چہرے پہ آتے زلزلے کے آثار مجھے مکمل طور پر اردگرد کے ماحول سے بے خبر کر کے اس کی یادوں کے ساتھ ساتھ بہنے پہ مجبور کر گئے۔ وہ مجھ سے تو کیا خود سے بھی بے خبر تھی۔

''وہ چیخی..... چیختی چلی گئی۔ میری نانی مجھے گود سے اُتار کے روتی پیٹتی اس کی طرف لپکی، میرا ابا ہکا بکا اس کی حالت دیکھتا رہا، پھر سب لوگوں کے ساتھ اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن وہ چیختی رہی، اپنے بال نوچتی، اپنا سینہ پیٹتی رہی، پھر اس نے اپنا آپ سب سے چھڑایا اور بھاگ گئی۔ ابا پیچھے پیچھے بھاگا..... بھاگتا گیا۔ لیکن سب کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے نیچے دریا میں چھلانگ لگا دی۔

پھر..... پھر سب نے بہت ڈھونڈا..... مگر اس کا کچھ پتا نہ چلا، اس کے لباس کی ایک دھجی تک کسی کے ہاتھ نہ لگی۔ اس رات دریا کو بھی جلال آیا ہوا تھا، اتنی تیز لہریں..... اتنی خوفناک موجیں..... نجانے کہاں بہا لے گئیں اسے.....'' آنسو اس کے گالوں پہ پھیلے تو وہ ہوش میں آ گئی۔ دونوں ہتھیلیوں سے آنسو پونچھ کر وہ [illegible] ہچکیاں روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں بھی دل پہ ایک انجان عورت کی اچانک اور عجیب سی موت کا دُکھ لیے خاموش بیٹھا رہ گیا۔

''لیکن اسے ہوا کیا تھا؟ کیا پہلے بھی کبھی اسے یہ پاگل پن کے دورے پڑتے تھے؟'' میرے سوال پہ وہ افسردگی سے مسکرائی۔

''پاگل پن..... ہاں وہ پاگل ہی تو تھی۔ کسی بہت اپنے کے اچانک بچھڑ جانے کا خوف شاید یونہی پاگل کر دیتا ہے۔ دراصل میری ماں نے شادی سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا، وہ ایک اچھی مسلمان عورت بننے کی پوری دیانتداری سے کوشش کرتی رہی، لیکن اس کے خون کی تاثیر، مٹی کی محبت اسے اس سرزمین سے دور نہ جانے پہ مجبور کرتی رہی، اس نے شادی سے پہلے یہی شرط رکھی تھی ابا کے سامنے کہ وہ کبھی یہ وادی اور اپنے لوگ نہیں چھوڑے گی۔ اپنا پیدائشی مذہب چھوڑ دینے کے باوجود وہ اتنی جلدی یہاں کے رسم و رواج اور عقیدوں کو فراموش نہیں کر سکی جو اس کی گھٹی میں پڑے تھے۔ اپنی ماں اور نانی کی طرح وہ بھی اپنا اور ابا کا

کھانے کا پیالہ الگ رکھتی تھی کہ مرد کا پیالہ جھوٹا کرنے والی عورت جلد بیوہ ہو جاتی ہے، یہ اس نے سُن رکھا تھا اور یہ بھی کہ تہوار کے رقص پہ ہاتھ چھوٹ جانا بہت بڑی بدشگونی ہوتی ہے اور جس کا ہاتھ اپنے ساتھی سے چھوٹ جائے وہ اسی ماہ مر جاتا ہے۔ یہ خوف میری ماں کو لے ڈوبا۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ابا کو..... شاید اسی لیے اس نے خود کو دریا کی لہروں کے سپرد کر دیا۔ تب سے میرے ابا نے رقص کرنا چھوڑ دیا۔ لیکن وہ اس جشن میں شریک ضرور ہوتا رہا۔

جن لوگوں نے کڑے وقت میں ان کا دُکھ بانٹا، ان کی خوشیوں میں شریک نہ ہونا تو کم ظرفی ہوتی ہے اس لیے ابا کے بعد میں بھی اس جشن میں باقاعدگی سے شامل ہوتی ہوں، لیکن اس دائرے میں شامل ہونے کی ہمت نہیں ہوتی۔ وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے ٹھوڑی گود میں ٹکائے بولتی رہی۔ لگ ہی نہ رہا تھا کہ کچھ منٹ پہلے ہم دونوں ایک دوسرے سے بالکل اجنبی تھے، یکسر ناواقف.....

''سنو، تم کیا ہر اجنبی سے یونہی گھل مل جاتی ہو۔''

بات تو نکل ہی چکی تھی منہ سے اب پچھتانے کے سوا کیا ہو سکتا تھا، لہٰذا اس میں بھی اس وقت اس کا خجالت سے سرخ ہوتا چہرہ دیکھ کے خود کو اس قدر نامعقول سوال پہ کوس رہا تھا۔ وہ [illegible] کچلتی [illegible] ہو گئی میں اسے روکنا چاہتا تھا لیکن وہ خود ہی ایک قدم آگے بڑھا کے پلٹ آئی۔

''[illegible] ہم اجنبی تھے لیکن میرے باپ کی قبر پہ دو پھول چڑھا کے اور دُعا پڑھ کے تم مجھے اپنے اپنے سے لگنے لگے [illegible] تو صرف یہاں تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔ مجھے تو خود [illegible] اور کیسے میں اتنی دیر باتیں کرتی رہی، مجھے معاف کرنا صیب اگر میری کوئی بات بری لگی ہو اور ہاں میں ہر اجنبی سے تو کیا، کسی بھی اجنبی سے باتیں نہیں کرتی، اگر وہ اجنبی ہو تو.....''

وہ چلی گئی اور میں اس کے آخری الفاظ پہ غور کرتا رہ گیا، ماحول کی ساری رنگینی، رقص و سرور کی گہما گہمی اب افسردگی کی کہر میں لپٹ چکی تھی۔ اس کا بھیگا لہجہ میرے اعصاب بھگو رہا تھا، اس کی کپکپاتی آواز میرا دل لرزا رہی تھی اور اس کی درد میں ڈوبی آنکھیں میری روح کے اندر تک شگاف ڈال کے مجھے یہ باور کرا رہی تھیں کہ کسی اجنبی کا دُکھ، اپنا دُکھ نہیں بن جاتا..... اگر وہ واقعی اجنبی ہو تو.....

urdu.com
URDU PHOTO

۱۹ مئی ۱۹۸۰ء

آج صبح ہی فیروز کی واپسی ہوئی، میرے کچھ کہنے سے قبل ہی وہ معذرتیں پیش کرنے لگا۔ وجہ وہی تھی یعنی موسم کی خرابی۔

"تم نے جشن تو انجوائے کیا ہوگا؟" اس کے سوال پہ میں چپ کر گیا۔ کیا کہتا، میں اپنی فیلنگز کسی کے ساتھ بھی شیئر کرنے میں بڑا کنجوس واقع ہوا ہوں یا یوں کہنا چاہیے قطعی نابلد ہوں اس معاملے میں۔ سوائے تمہارے اے میری ڈائری، کوئی نہیں جس سے میں اپنے احساسات و جذبات بیان کر سکوں، لیکن کل رات کے بعد سے جو میں محسوس کر رہا ہوں وہ ابھی میرے قلم کی گرفت میں کیا آئے گا، اس جذبے کو ابھی تک میرا دل بھی صحیح طریقے سے پرکھ نہیں سکا۔ کبھی میں خود کو بے حد افسردہ محسوس کرتا ہوں، اداس، قنوطی، کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے خزانوں کے منہ کھل گئے ہوں، میرے لیے اور میں جھولی میں خوشیاں بھر بھر کے تھک رہا ہوں۔ کبھی کبھی مجھے اپنا آپ یکدم تنہا تنہا سا لگنے لگتا ہے۔ یہ چہرہ نا آشنا محسوس ہوتا ہے اور کبھی ایسا لگتا ہے جیسے اجنبی دیس میں کسی بہت اپنے نے بڑی گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا ہو۔ پتہ نہیں یہ سب کیا ہے۔

میں آج سارا دن کمرے سے نہیں نکلا۔ میرے میزبان اسے رت جگے کی تھکن سمجھتے رہے، حالانکہ وہ کیا جانیں تھکن سے تو مجھے جیسے آوارہ گرد کا کبھی واسطہ ہی نہیں پڑا۔ فیروز سمجھ رہا ہے میں اس کی وجہ سے باہر نہیں نکل رہا اور ایک بات کہہ کر تو اس نے مجھے چونکا ہی دیا۔

"یار از ریاب جاؤ لالہ کہیں گھوم پھر آؤ، پھر نہ کہنا فیروز نے اپنے گھٹنے سے لگا کے بٹھا دیا تھا۔ کون جانے دوبارہ تم یہاں کبھی آ پاؤ یا نہیں۔"

"دوبارہ..... ہاں مجھے واپس بھی تو جانا ہے....." [illegible] ہی الفاظ پہ..... آ کے واپس جانا تو ایک حقیقت ہے اس حقیقت کو کیسے فراموش کر بیٹھا اور کل کے لیے..... میری خاموشی محسوس کر کے وہ بولا۔

"یار تم تو بنجارے چھڑے ہو، میں ٹھہرا زمیندار قسم کا بندہ اور وہ بھی ایک عدد پٹھانی کا شوہر..... اگر تم دو دن اور ٹھہرنا چاہتے ہو تو میں اپنا پروگرام آگے کر لیتا ہوں اور اگر زیادہ دن رُکنے کا ارادہ ہے تو یار پھر مجھے فی الحال اجازت دو، چند انتہائی ضروری نوعیت کے کام وہاں رُکے پڑے ہیں۔ ہفتہ دو ہفتہ بعد پھر آ جاؤں گا۔ میرے لیے پہاڑوں کا یہ سفر کوئی نئی بات نہیں۔ تم کہاں آئے دن یہ تکلیفیں اُٹھاتے پھرو گے۔ اچھی بات ہے کچھ دن اور رہ لو، اگر دل

لگ گیا ہے تو....."

وہ تو سو گیا، لیکن میرے لیے پھر سے کئی سوال چھوڑ گیا۔ میں الجھنے لگا کہ واپس جانے کی بات سن کر میرا دل رکا تو کیوں رکا؟

ٹھہرنے کا سن کر میرے اندر اطمینان نے ڈیرے ڈالے تو کیوں؟

وہ کیا ہے جو ان وادیوں میں میں تلاشنا چاہتا ہوں؟ وہ کون ہے جس کی کشش مجھے اس زمین سے قدم آگے نہیں بڑھانے دیتی؟

میں نے آنکھیں موندیں تو شہد کے دو چشمے جھر جھر کرتے ہوئے بہنے لگے، میں نے آنکھیں کھول لیں۔

جواب مل چکا تھا۔

ایسا جواب جو اپنے جلو میں بہت سے سوال لیے ہوئے تھا۔

۲۰ مئی ۱۹۸۰ء

دو باش تک میں اور ژان فیروز کے ساتھ گئے۔ اس نے میرے بارے میں اسے اتنی تاکیدیں کیں کہ مجھے ہنسی آنے لگی۔ اسے وین میں سوار کرا کے میں نے ژان خان کو بصد اصرار اس کے کام پہ بھیجا، ورنہ تو وہ فیروز کی تازہ ترین ہدایات کے زیر اثر مجھے ایک پل کو جدا کرنے پہ تیار نہ تھا۔ وہاں سے میرے قدم خود بخود اس طرف اُٹھ گئے۔

[illegible] دیر بعد میں نے خود کو محمد علی نامی شخص کی قبر پہ موجود پایا۔ نجانے کون شخص تھا یہ [illegible] اور کتنا [illegible] عشق تھا اس کا جس کے کھونے کے ڈر نے ایک عورت کے حواس پل بھر میں [illegible] اسے ایک ساعت میں دیوانگی کی سرحد پہ لا کھڑا کیا اور وہ عورت..... کتنی کشش [illegible] اس کی محبت میں [illegible] نے ایک شخص کو اپنا خاندان، رشتے ناتے، ذات پات، [illegible] کاروبار، سب بھلا کے اس حسین [illegible] پسماندہ سی وادی میں کافر قوم کے ساتھ غربت میں زندگی گزارنے پہ مجبور کر دیا۔ میری محویت ٹوٹی، جب میرے عقب سے دو ہاتھ طلوع ہوئے اور قبر پہ گلاب کے پھولوں کی بارش برسا گئے۔ میں نے پلٹ کے دیکھا۔ حد درجہ سنجیدگی لیے وہ مومنہ تھی۔ میں ذرا سا مسکرایا، لیکن وہ مجھے دیکھے بغیر قبر کے قریب بیٹھ گئی اور زیر لب آیات کا ورد کرنے لگی۔ یقیناً اس کے گریز کا سبب میرا وہ دل آزار جملہ تھا۔ مجھے نئے سرے سے خود پہ غصہ آنے لگا۔ میں کاٹن کی آرام دہ ٹراؤزر ذرا سا اُوپر کھینچ کے اس کے نزدیک دو زانو بیٹھ گیا۔

1urdu.com
URDU PHOTO

اس نے پڑھنے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے اور بلند لرزیدہ دراز پلکوں کے ساتھ وہ مجھے اتنی مقدس، اتنی نورانی لگی کہ مجھے اپنا اس کے اس قدر نزدیک بیٹھنا گستاخی محسوس ہوا، میں ذرا سا کھسکا۔ چہرے پہ ہاتھ پھیر کے اس نے ایک نظر میرے پیچھے ہونے پر ڈالی اور کہے بغیر نہ رہ سکی۔

''اچھا ہوا صیب تم خود ہی پرے ہو گئے ورنہ پھر کہتے پھرتے، کیا میں ہر اجنبی کو اتنا ہی قریب بیٹھنے دیتی ہوں۔''

''لاحول ولاقوۃ'' اس کی جلی کٹی بات پہ مجھے تاؤ آ گیا۔

''مومنہ مجھے گھما پھرا کے بات کرنا نہیں آتی، بلکہ یوں کہو آتی ہی نہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ اس وقت میری بات کا یہ مطلب نہیں وہ تھا دراصل تم اتنی اداس تھیں اور رو رہی تھیں، مجھے کسی لڑکی کو چپ کرانا نہیں آتا اور نہ ہی تسلی دینا۔ میں نے اس وقت صرف یہ سوچا تھا کہ کوئی ایسی بات کروں جس کا تعلق اس بیتے واقعے سے نہ ہو تا کہ تمہیں اداسی کی اس کیفیت سے نکال سکوں۔ ہاں میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ جلدی میں انتہائی فضول بات منہ سے نکل گئی۔ تمہیں بُرا لگنا ہی چاہیے تھا لیکن اگر میں معافی مانگوں تو کیا تم اپنا دل میری طرف سے صاف کر لو گی؟''

وہ کوئی جواب دیے بغیر قبر کی گرد سے سوکھے پتے اور ٹہنیاں اُٹھانے لگی۔ مجھے لگا جیسے وہ کوئی جواب دیے بغیر لوٹ جائے گی لیکن جاتے جاتے وہ پھر سے ایک عجیب سی بات کہہ گئی۔

''مجھے صرف یہ بُرا لگا صیب کہ تم نے خود کو اجنبی کہا۔'' اس کا یہ سادہ سا جملہ مجھے سن کر گیا اور پھر سے سوالوں کے جنگل میں بھٹکنے کو چھوڑ گیا۔ آج پھر طویل تاریک رات ہو گی، چیختے چنگھاڑتے سوال ہوں گے اور جواب میں میرے دل [illegible]

اُف..... میں کیوں رُکا..... کیوں نہ آج ہی لوٹ گیا، فیروز کے ساتھ مجھے بیڑیاں پسند نہیں۔ الجھاتے سوالوں سے نفرت ہے مجھے..... ایک جگہ ٹھہرنے سے میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ پھر میں کیوں رُکا..... کیوں..... آج رات مجھے اس کا جواب ڈھونڈنا ہے۔ ورنہ واپس لوٹ جانا ہے۔

۲۱ مئی ۱۹۸۰ء

اور میں واپس نہیں لوٹا۔

مجھے لوٹنا بھی نہیں تھا۔ کم از کم اکیلے تو نہیں۔ اس طرح خالی ہاتھ تو نہیں، کبھی کبھی خود سے ہار مان لینا بھی کتنا اچھا لگتا ہے۔ رات بھی یہی ہوا تھا۔ اپنے ذہن و شعور کے تمام دلائل، جواز اور حیلے بہانوں کے پرخچے اڑتے دیکھے تھے میں نے، صرف دل کی ایک ذرا سی ضد پہ..... جو ہمک ہمک کے بس یہی کہتا جا رہا ہے۔ صرف وہ..... بس وہ..... اور کوئی نہیں..... اور کچھ نہیں..... صرف..... وہ.....

۲۲ مئی ۱۹۸۰ء

کل کا سارا دن میں اُسے وادی کے مختلف حصوں میں تلاشتا رہا، لیکن وہ مجھے نہ ملی اور آج میں نے اسے جھیل سوک کے پاس پایا۔ وہ خوبانیاں ٹھنڈے پانی سے دھو دھو کے ٹوکری میں رکھتی جا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کے اس کا ذرا سا مسکرانا مجھے حوصلہ دلا گیا کہ اس دن ہونے والی تلخی کا اثر اس کے دل سے زائل ہو چکا تھا۔

''کہاں تھیں تم مومنہ میں کل سارا دن تمہیں ڈھونڈتا ہی رہا۔''

میں لہجے کی بے چینی چھپانے میں قطعی ناکام رہا تھا اور یوں بھی میں اب اس سے کچھ چھپانا ہی کب چاہتا تھا۔

''کوئی کام تھا صیب؟'' وہ بدستور اپنے کام میں مشغول تھی۔

''مجھے بھلا کیا کام ہو سکتا ہے، تم سے اور یہ تم مجھے صاحب صاحب کیوں پکارتی ہو، خان زریاب خٹک ہے میرا نام۔''

''اچھا نام ہے۔'' وہ منہ پہ زور زور سے چھپاکے مارنے کے بعد اس بڑے سے پتھر کے ایک سرے پہ ٹک گئی، جس پہ میں ٹانگیں پسارے بیٹھا تھا۔ میں نے ایک نظر بھر کے اس کے شفاف چہرے پہ چمکتے ہوئے پانی کے قطروں کو دیکھا۔

''تم نے بتایا نہیں کل سارا دن کہاں غائب رہیں تم۔ پوری بستی میں ہر جگہ کہیں بھی نظر نہیں آئیں۔'' اس نے میری بے تابی اور لہجے کی تڑپ کو حیرت سے محسوس کیا۔

''میں..... میں..... ''بشالینی'' گئی تھی۔ میرے ماموں کی بیٹی ہے وہاں، اس کی خیر خبر کے لیے کل میں سارا دن وہاں رُکی تھی۔ آج میری خالہ وہاں گئی ہے اور میں ان دونوں کے لیے یہ پھل، انڈے اور یخنی لے کے جا رہی ہوں۔'' اس نے ٹوکری کی طرف اشارہ کیا، جس میں اس کا ایک سیاہ جوڑا بھی رکھا تھا۔

''کیا تم اور کچھ دن وہاں رکو گی۔'' میرا دل تنگ پڑنے لگا۔

Urdu Photo

"نہیں تو..... بس یہ دے کے آ جاؤں گی۔"

"تو یہ کپڑے، میں سمجھا وہاں رہنے جا رہی ہو۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ ٹوکرا کمر پہ ٹکائے کھڑی ہو گئی۔

"میں بھی چلوں تمہارے ساتھ، یہ سامان اُٹھا لیتا ہوں۔" میرے ہاتھ آگے بڑھانے پہ وہ گھبرائی۔

"نہیں، نہیں..... تم کیسے جاؤ گے، تم نہیں جا سکتے، وہاں یہ کوئی....."

"بہت دُور ہے کیا، یہ بشالینی گاؤں" اس نے بے ساختہ مسکراہٹ روکی۔

"بشالینی۔" گاؤں نہیں ہے وہ سامنے جو جھیل کے اس طرف گارے کا بڑا سا مکان نظر آ رہا ہے ناں اسے بشالینی کہتے ہیں اور اب خدا کے لیے مجھے جانے دو۔"

وہ زچ سی ہو گئی، اس کے چہرے پہ پھیلی سرخی مجھے لطف دے رہی تھی، پھر بھی میں نے اس کی حالت پہ مزید ستم نہ ڈھاتے ہوئے راستہ چھوڑ دیا۔

"اچھا جاؤ، لیکن میں کل اسی وقت اسی جگہ تمہارا انتظار کروں گا۔ ضرور آنا اور مجھے بتانا کہ تمہارے ماموں کی بیٹی کو لڑکا ہوا یا لڑکی۔"

وہ جاتے جاتے چونک کے پلٹی اور میرے شرارت بھرے چہرے پہ ایک خفگی بھری نظر ڈال کے تیز تیز قدم اُٹھانے لگی۔ اس کی حیا اور جھجک نے میرا دل موہ لیا۔ باپ کے مسلمان خون کی تاثیر اس کی رگوں میں دوڑ رہی تھی جس نے اسے یہاں کی دیگر دوشیزاؤں کی طرح بے باک نہیں ہونے دیا اور ایک عام سی بات کہنے میں اس کا یہ تذبذب مجھے اتنا اچھا لگا کہ میں بشالینی کے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود اس کے سامنے انجان بنا رہا۔

فیروز کے ساتھ پہلے دن کی سیاحت کے دوران میں اس جھیل پہ بھی آیا تھا اور اس کنارے کے بالکل سامنے موجود بغیر کسی کھڑکی اور روشن دان کے نیچی چھت والے اس کچے مکان کو دیکھ کر میں نے ایران چاچا سے استفسار کیا تھا کہ یہ مکان آبادی سے اتنا الگ تھلگ کیوں ہے۔

یہ "بشالینی" ہے۔ ہمارے ہاں جب کسی عورت کو بچہ ہونے والا ہو تو وہ یہاں قیام کرتی ہے، اپنے مرد اور اہلِ خانہ سے کٹ کر، ناپاکی والی عورت کو آبادی میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں۔ یہاں صرف اس کی دائی رہ سکتی ہے اس کے ساتھ، یا پھر گھر کی عورت ملنے آ

سکتی ہے۔ لیکن اسے بھی رات رُکنے کی اجازت نہیں۔ بلکہ وہ اپنے ساتھ ایک صاف لباس لاتی ہے جو بشالینی کی حدود سے باہر رکھا جاتا ہی۔ زچہ سے ملنے کے بعد وہ جھیل کے پانی سے غسل کر کے اپنا پہنا ہوا لباس دھوتی ہے، اور صاف لباس پہننے کے بعد بستی میں قدم رکھتی ہے۔ مردوں کا اس عمارت کے قریب جانا منع ہے۔"

ایران چاچا کے تفصیل سے بیان کرنے پہ فیروز نے ریمارکس دیا تھا۔

"تو عورتوں کا کمیونٹی سینٹر ہے یہاں۔"

۲۳ مئی ۱۹۸۰ء

مجھے اس سے تقریباً دس بجے ملنا تھا، لیکن فجر کی اذان سے بھی کچھ پہلے مجھ پہ بے چینی چھا گئی اور ناشتے کے بعد تو مجھ سے ایک پل بھی نہ رُکا گیا اور میں جھیل سہوک کی طرف نکل پڑا۔ وہاں پہنچ کے میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اس سرمئی چکنے پتھر پہ مومنہ کو بیٹھے دیکھا۔

"تم کب آئیں؟"

"بس ابھی....." وہ بھی شاید اپنی جلد بازی پہ خجل سی تھی۔

"پھر..... کیا خبر ہے؟" میں نے اسے چھیڑا۔

"بیٹا ہوا ہے۔" اس نے خوشی سے چُور لہجے میں بتایا۔

"چھ بیٹیوں کے بعد۔"

"مبارک ہو۔" میں اس کی پُر خلوص اور بے پایاں محبت سے متاثر سا ہو گیا جو اس کے دل میں خود سے وابستہ ہر شخص کے لیے تھی۔

"اور پتہ ہے میں نے اس کا نام بھی رکھ دیا ہے۔ "زریاب خان۔" اس نے جھجکتے ہوئے بتایا۔ اس کی زبان سے پہلی بار اپنا نام سُن کر میں سحر زدہ ہو گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس نے میرا نام نہیں بلکہ میرے نام پہ پھول ہی پھول چن دیئے ہوں۔ میری خاموشی محسوس کر کے وہ اٹک اٹک کے بولی۔

"کیا ہوا صیب..... برا لگا تمہیں..... تمہارا نام میں نے ایک..... میرا مطلب ہے کہاں تم کہاں وہ..... شاید میں نے غلط کیا ناں۔"

"بالکل غلط کیا..... مجھے دوبارہ صاحب پکار کے تم نے بالکل غلط کیا۔ میں نے کل ہی تمہیں منع کیا تھا کہ اب مجھے صاحب مت پکارنا۔ سخت بُرا لگتا ہے مجھے۔"

Sabha URDU PHOTO

"اس میں بُرا لگنے کی کیا بات ہے۔ یہ کوئی خراب لفظ ہے کیا..... میں تو تمہیں عزت دینے کے لیے صیب کہتی ہوں۔"

"مجھے تم سے احترام نہیں..... محبت چاہیے۔" میری اس بات پہ اس کا ردِ عمل وہی تھا جو ہونا چاہیے تھا۔ وہ حسین تھی..... یہ تو میں جانتا تھا، مگر اس موقع پہ چہرے پہ سجانے کے لیے اتنے رنگ اس نے کہاں چھپا کے رکھے تھے اس کا اندازہ میں نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کچھ نہ بولی مگر اس کے نیم وا کپکپاتے لبوں سے سانسوں کی مدھم آوازیں انوکھے اقرار کر رہی تھیں۔ شہد لٹاتی جھکی آنکھیں ایک ہی بار حیرانی سے مجھ پہ اُٹھی تھیں پر جھکنے سے پہلے خاموشی سے ایک عہد کر گئی تھیں۔

۲۴ مئی ۱۹۸۰ء

آج مومنہ کا ایک اور وصف کھلا مجھ پہ۔ وہ اچھا گنگنا لیتی ہے یہ تو میں پہلی ملاقات میں ہی جان گیا تھا۔ آج میرے بار بار اُکسانے پہ بھی گنگنانے پہ تیار نہ ہوئی۔

"میں نے سنا ہے یہاں کے لوگ خاصے شاعرانہ اور عاشقانہ مزاج رکھتے ہیں۔ دو شیزائیں اپنے محبوب کے لیے گیت لکھتی ہیں اور گاتی ہیں۔ تم پر تو ذرا اثر نہیں دکھتا ہے ان فضاؤں کی رنگینی کا۔" میں نے جھوٹ موٹ منہ پھلایا۔

"اچھا میں تمہیں۔ "برہ" سناتی ہوں، مگر تم میری طرف دیکھنا مت، بالکل بھی نہیں ورنہ میں گا نہیں پاؤں گی۔" وہ ہار مان کے بولی۔

"کیوں..... یہ کیسی پابندی ہے، میں کیوں نہ تمہیں دیکھوں..... ایسا ہی مشکل لگتا ہے، تمہیں میرے سامنے گیت گانا تو تم اپنی آنکھیں بند کر لو۔"

میں ایک پل کے لیے بھی اس ست رنگے چہرے کی [illegible] نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے شہد کی جھیلوں پہ گلابی پپوٹوں کے بادل گرائے۔ ہلکے سُروں اور سادہ سی لے میں اجنبی الفاظ کا جادو میرے اردگرد پھیلنے لگا۔ اس کے پپوٹوں اور شفاف گردن پہ بیک وقت ہلکی نیلی رگیں اُبھر اور ڈوب رہی تھیں، رُخساروں پہ ہلکورے لیتے بھنوروں میں، میں ایسا کھویا کہ وہ کب خاموش ہوئی پتہ ہی نہ چلا۔

"کیسا لگا؟" وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی میں کچھ بھی نہ کہہ سکا وہ مزید بتانے لگی۔

"برہ" یہاں کا لوک گیت ہے، جس میں ایک لڑکی اپنے ایسے محبوب کے لیے محوِ انتظار ہے جو سفر میں ہے۔ وہ اس کی جدائی میں اپنی حالت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ سفر

میں اُٹھائی جانے والی اس کی صعوبتوں پہ بھی فکر مند ہے۔

اے میرے محبوب
میں ہر روز تمہارے لیے اپنے بالوں کے کنڈل بنا کے رکھتی ہوں۔
میری آنکھیں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں
تم نے چھ ماہ دُکھ اُٹھایا ہے
اے میرے محبوب
لوٹ آؤ
میں تمہاری ٹانگوں کی تھکن، اپنے ہاتھوں میں سمولوں

اس نے بڑی خوب صورتی سے گیت کا ترجمہ پشتو میں دہرایا۔ تو مجھے ایک خیال آیا۔

"سنو، تم کچھ لکھنا پڑھنا جانتی ہو؟"

"تھوڑا بہت، جتنا ابا پڑھا سکا۔ یہاں کتابیں عام نہیں ملتیں اس لیے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی، میرا ابا بھی کوئی عالم فاضل تو نہیں تھا، بس پڑھنا اور لکھنا سکھا دیا۔ نماز، کلمے بھی یاد کرا دیے۔ ماں کے بعد ابا بہت بکھر گیا تھا۔ شادی کے پانچ چھ سال بعد تک بھی وادی کے اکثر لوگوں نے اِسے دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ابا، ماں کا مذہب اختیار کر کے ہم لوگوں میں مل جائے لیکن اس کے برعکس ماں نے اس کے رنگ میں رنگنا مناسب سمجھا، یہ بات بہت سے لوگوں کو ہضم نہ ہوئی انہوں نے اس پہ اسی وادی میں [illegible] کی شرط عائد کی اور ان کی توقع کے برعکس اس نے یہ بات مان لی۔ اس لیے وہ مجبوراً [illegible] برداشت کرتے رہے۔

ماں کے بعد ابا چاہتا تو مجھے لے کے یہاں سے جا سکتا تھا۔ اپنے شہر یا کہیں اور بھی، اس کے ماں باپ زندہ نہ تھے، مگر بہن بھائی ذات برادری سب تھا۔ وہ کہیں جا کے نئے سرے سے زندگی بسر کر سکتا تھا، لیکن وہ نہیں گیا، اس وادی کو چھوڑ کے نہیں گیا، جو اس کے عشق کی گواہ تھی جو اس کی محبت کی مہربان گود تھی۔

یہاں اپنی جگہ مضبوط کرنے کے لیے، ان لوگوں کو اپنانے کے لیے اس نے کیا نہیں کیا۔ یہ چند ایک ذرا پڑھے لکھے نوجوان نظر آ رہے ہیں۔ یہ ابا ہی کی بدولت ہیں۔ یہاں کے کاشت کاروں کو منڈی میں صحیح بھاؤ لگوانا بھی ابا نے سکھایا۔ بہت سی عورتیں اپنے شیر خوار بچے لیے اس کے پاس آتیں کہ وہ قصبے جا کر اسپرین، کھانسی کے شربت اور درد وغیرہ

urdu.com
URDU PHOTO

کی گولیاں لا کے رکھتا تھا۔ زیادہ بیمار بچوں کو خود قصبے لے کر جاتا، علاج کے لیے۔ میری بوڑھی نانی کا سارا خرچہ اُٹھایا، اس کی اپنی ماں جیسی خدمت کی۔ اپنی ان ہی عادتوں کی وجہ سے اس نے اپنی عزت اور مقام تو بنا ہی لیا، آج میں بھی صرف اس کے کرموں کا پھل ہی کھا رہی ہوں، یہاں کا بچہ بچہ مجھے تعظیم دیتا ہے، میرے رشتے دار مجھے کسی امانت کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ رہتی ہوں لیکن اپنے ابا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق وہ تمام عقیدے اور ارکان ادا کرتی ہوں، روزے رکھتی ہوں، نماز پڑھتی ہوں۔ کبھی کسی نے میرے کسی عمل پہ اعتراض کیا نہ روکنے کی کوشش کی۔"

"تمہارے ابا کہاں کے رہنے والے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"لاہور نام بتاتے تھے اپنے شہر کا۔ سنا ہے بہت بڑا اور خوب صورت شہر ہے۔ تم نے دیکھا ہے۔" وہ فرطِ اشتیاق سے بولی۔

"ہاں کئی بار، واقعی بڑا پُر رونق شہر ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ لاہور کا رہنے والا کوئی شخص اتنے برسوں تک کیسے اس شہر کو بھلائے رہ سکتا ہے۔"

"عشق..... صرف عشق....." وہ جذب کے سے عالم میں کہنے لگی۔

"ابا جیسا عشق کوئی اور نہیں کر سکتا۔" اس کی بات پہ میں نے کہا۔

ہم بھی اُڑائیں خاک بیاباں وشت سے
ہم کر رو تو ہی
ہم بھی دکھائیں چاک گریباں لیکن جانانِ دیکھو تو

"دیکھیں گے۔" اس کے منہ سے پہلی بار شستہ اردو کے الفاظ سن کر میں بُری طرح چونکا۔

"تم..... اُردو بھی....." اس سے پہلے ہمارے مابین صرف پشتو میں ہی گفتگو ہوا کرتی تھی۔

"تم نے پہلے بتایا ہی نہیں کہ....."

"تم بھی صاحب....." وہ کھلکھلائی۔

"ابھی میں نے بتایا تھا ناں کہ میں پڑھنا اور لکھنا جانتی ہوں تم تب ہی سمجھ جاتے۔"

"ہاں بس وہ....." میں خجل سا ہو گیا اس کے سامنے میں اتنا ہوش میں رہتا ہی کب تھا کہ ہر بات کی باریکی میں جا سکوں۔

۲۸ مئی ۱۹۸۰ء

زندگی اتنی خوب صورت ہو جائے گی یہ کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ دن اتنے مہکنے لگیں گے، خبر ہی نہ تھی۔ پہروں اس کے ساتھ بتا کے بھی بچھڑتے وقت اداسی دل پہ پنجے گاڑ لیتی ہے۔ گھنٹوں اس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی ہزار باتیں کرنے کے بعد بھی واپس آ کے لگتا اس سے وہ سب تو کہا ہی نہیں جو پچھلی شب سوچ کے رکھا تھا اور تو اور برسوں بعد ایسا ہوا ہے کہ میں نے کئی راتیں ڈائری نہ لکھی۔ اپنا دل میں کھولتا ہی ڈائری کے ذریعے تھا اور اب جب دل کو اک نیا رفیق مل گیا ہے تو.....

وہ بولتی بھی تو اتنا اچھا ہے کہ گھنٹوں سنتے رہنے سے بھی تھکتا نہیں ہوں۔ وہ خود بھی جب تھک جائے تو چپ کر جاتی ہے اور تب میں اسے کچھ نہ کچھ کہہ کر چھیڑتا ہوں۔ غصہ بھی تو اسے اس قدر جلد آتا ہے تب وہ پھر سے بولنا شروع کر دیتی ہے۔ میرا دل کرتا ہے وہ بولتی رہے، میں سنتا رہوں چاہے وہ غصے میں ہی کیوں نہ کچھ کہہ رہی ہو۔ ابھی کل ہی وہ میری معلومات میں اضافے کے لیے وادی کے مختلف رسم و رواج اور عقیدے بتا رہی تھی۔

"یہاں کے لوگ نہایت کمزور عقیدہ رکھتے ہیں۔ کچھ تو تدریس سے بے بہرہ رہنے کی بدولت بھی ہے۔ بہر حال جو بھی ہے اپنے عقائد پہ یہ سختی سے عمل کرتے ہیں۔ "اگر" یعنی جمعہ کا دن مقدس ہوتا ہے اس دن کوئی کام نہیں کیا جا سکتا، البتہ تقریبات وغیرہ منعقد کرنے کے لیے یہ دن مناسب ہوتا ہے۔ اسی طرح 20 کا ہندسہ اور مارچ، اپریل مئی کے مہینے مقدس کہلاتے ہیں۔ پیاز کو یہ لوگ جنت کا مبارک پھل سمجھتے ہیں۔ عورتوں کے لیے سیاہ رنگ مخصوص ہے۔ انہیں بال کٹوانا اور سر ننگا رکھنا منع ہے۔ مُرغ حرام ہے۔ اسی طرح اپنا پالا جانور خود کھانا بھی حرام ہے۔ عورت پر زمریتی کا گوشت کھانا حرام ہے وغیرہ وغیرہ۔ آسمانی آفت اور نظام کے بارے میں ان کا اپنا نظریہ ہے جیسے بجلی چمکنے کا مطلب ہے پریاں لڑائی کے دوران تلوار چلا رہی ہیں۔ اور جب گھوڑا اور گائے آسمان پہ دوڑ لگاتے ہیں تو آندھی آ جاتی ہے۔ پہاڑوں پہ پریاں رہتی ہیں، جن کی خدمت میں نذر چڑھانا ہر شخص پر فرض ہے جو کوتاہی کرے، پریاں اس کی زندگی پہ اچھا بُرا اثر ڈال سکتی ہیں۔"

وہ چپ ہوئی جیسے میری عدم دلچسپی کو محسوس کر لیا ہو۔ میں دلچسپی لے تو رہا تھا مگر اس کے ہاتھوں کی حرکت میں جو الفاظ کے ساتھ ساتھ جاری تھی۔ اسے دوبارہ بولنے پہ اُکسانے کے لیے میں نے چھیڑا۔

UrduPhoto.com
Saba

"یہ تم بار بار۔" "وہ لوگ، وہ لوگ" کیا کہہ رہی ہو۔ تم خود کون سی کم ہو۔ یاد نہیں اس دن بستی میں گھر دکھاتے ہوئے کیا ہوا تھا۔ ہر گھر کے داخلی دروازے پہ بکرے کے دو سینگ اور پتے لٹک رہے تھے۔ میں نے ہاتھ لگانا چاہا تو تم نے فوراً روک دیا۔

"نہ نہ ہاتھ مت لگانا۔ انہیں ہاتھ لگانے والا فوراً بیمار پڑ جاتا ہے۔" حسب توقع اس کا منہ پھول گیا۔

"اس سے کیا ہوتا ہے، میں کوئی ان کے مذہبی عقیدوں پہ تو یقین نہیں رکھتی۔ نذر نہیں چڑھاتی، قربان گاہ نہیں جاتی، میرا ایمان بھی وہی ہے جو تمہارا ہے کہ بارش، آندھی، طوفان بھی زندگی اور موت کی طرح خدا کی طرف سے آتے ہیں اور ہر انسان کی زندگی میں جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے۔ آئندہ ایسی بات مت کرنا، مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ کسی کو کیا خبر میں کن کن حالات میں اپنا ایمان بچائے بیٹھی ہوں۔" وہ زیادہ ہی گرم ہو گئی۔

"اوہو تم تو بُرا مان گئیں۔ میں نے ایسا کب کہا کہ تم خدانخواستہ..... وہ تو اس دن تم نے ہی یہ بات کہی تھی جو میں نے یاد دلا دی۔"

"تو کیا ہوا..... ان لوگوں میں پلنے بڑھنے کا کچھ اثر تو ہونا ہی تھا۔ میری فطرت نہیں بدل سکتے یہ لوگ، عادتوں پہ تو اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ پتا ہے ہمارے ہاں چار پائی شام سے پہلے پہلے جہاں بچھانی ہو وہاں بچھالی جاتی ہے شام کے بعد کہیں اور منتقل نہیں کی جاتی۔ گھر کی باقی لوگوں کی طرح میں بھی اسی معمول پہ کاربند ہوں۔ لیکن یہ اور اس جیسی دوسری بے ضرر سی باتیں یہ تھوڑا ظاہر کرتی ہیں کہ میں ان میں سے ہوں۔ میرا ابا تو پکا مسلمان تھا۔ لیکن گھر سے نکلتے ہوئے اگر کالی بلی راستہ کاٹ جائے تو سب کام چھوڑ کر واپس آ جاتا تھا۔ میں نے ایک بار پوچھا بھی تو بے چارگی سے کہنے لگا۔

"پتہ نہیں، مگر ماں ہمیشہ کہتی تھی کالی بلی کا راستہ کاٹ دینا منحوس ہوتا ہے۔"

"اچھا تمہارے ابا تم سے اپنے گھر کی، اپنے شہر کی باتیں کرتے تھے۔" بمشکل میں موضوع تبدیل کر سکا تھا۔

"ہاں کبھی کبھی انہیں شہر سے زیادہ اپنا گاؤں یاد آتا تھا، جس میں انہوں نے اپنا بچپن گزارا۔ اپنے اسکول کی باتیں اور ایک گیت تھا اُردو میں نہیں، کسی اور زبان میں شاید ان کی مادری زبان میں وہ اکثر گنگناتے تھے۔ مجھے بہت پسند تھا۔ سمجھ میں نہ آنے کے

باوجود دل پہ اثر کرتا تھا۔ ماں کے بعد ابا کے اس گیت کے بولوں میں اور بھی درد آ گیا تھا۔"

"پنجابی میں ہوگا۔" میں نے قیاس کیا۔

"پتہ نہیں، بہت مشکل زبان تھی، اردو کے دو تین لفظ تھے اس میں عمراں کا لیا۔" وہ ذہن پہ زور ڈال رہی تھی۔

"عمراں لنگیاں پباں پار" میں بھانپ گیا۔

"ہاں..... ہاں وہی۔۔۔" وہ اچھلی۔

"پنجابی کا گیت ہے، بڑا مشہور۔ جہاں پنجابی بولی نہیں جاتی وہاں بھی پسند کیا جاتا ہے۔ مجھے بھی اسے سننا بہت اچھا لگتا تھا، میری ایک پنجابی دوست نے اس کا لفظ لفظ ترجمہ جب مجھے بتایا مجھے اس گیت سے اور بھی محبت ہو گئی۔"

"مجھے سناؤ ناں۔" اس کی فرمائش پہ میں نے صاف انکار کر دیا۔

"میں گاؤں گا نہیں۔ مجھے گانا نہیں آتا البتہ تمہیں ویسے ہی اس کے بول سنا دیتا ہوں، مطلب کے ساتھ۔" تب میں نے اسے کئی بول مطلب سمیت سنائے جو بات اسے زیادہ اچھی لگتی وہ دوبارہ فرمائش کر کے سنتی۔

عمراں لنگیاں پباں پار
ہالے وس او کا لیا

یعنی ساری عمر پنجوں کے بل راستہ تکتے گزر گئی۔ کچھ پل اور ٹھہر جا اے کالے بادل۔ ابھی نہ برس شاید وہ آتا ہی ہو۔

پھلاں دے رنگ کالے
سرخ گلاباں دے موسم وچ
پھلاں دے رنگ کالے

جدائی میں گزری بہار بھی ویران دکھتی ہے، اور سرخ گلابوں کے موسم میں پھولوں کے رنگ سیاہ نظر آتے ہیں۔"

یہاں اس نے مجھے ٹوک کر دوبارہ اشعار اور مطلب سنے۔

"مجھے کچھ صحیح طرح سمجھ نہیں آیا۔ جدائی کا کرب اپنی جگہ، لیکن پھولوں کا تو جو رنگ ہے سو وہی رہے گا۔ بھلا سرخ گلاب کالے کیسے نظر آنے لگتے ہیں۔"

Urdu.com
UrduPhoto.com
Saba

"بھئی میں تو لفظ بہ لفظ ترجمہ ہی دہرا سکتا ہوں، کوئی شاعر تو نہیں جو شعر کی روح میں اُتر کر معنی چرالوں۔ اتنی شاعرانہ حس ضرور ہے کہ شاعر نے جو کیفیت بیان کی ہے اس کو دل کے اندر تک محسوس کر سکوں لیکن معاف کرنا میں اتنا بڑا زبان دان نہیں جو مکمل تشریح کے ساتھ تمہاری تسلی کرا سکوں۔ ہاں اگلے بول سنو جو میں بڑے دل اور جذب کے ساتھ کہہ رہا ہوں شاید یہ بات سمجھ جاؤ۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ساری مٹھاس اپنے اندر سموتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

غلام فرید میں تاں دوزخ سڑساں
جے میں ملھ ماہی دلوں موڑاں

"اگر کبھی میں نے تم سے منھ موڑا، کبھی زندگی میں تمہارا دل دکھایا، کبھی بے وفائی کا سوچا بھی تو خدا مجھے دوزخ میں پھینک دے، جسے ازل تک صلے کے لیے ..."

میں اپنا عہد پوری سچائی کے ساتھ دہرا رہا تھا، جب ان شہد سے بھری جھیلوں میں ہلکا سا تلاطم پیدا ہوا اور ایک گلابی ہتھیلی میرے لبوں پہ ٹھہر گئی۔

☆☆☆

۳۱ مئی ۱۹۸۰ء

فیروز کی اچانک آمد پہ میں حیران رہ گیا۔ وہ دو ہفتے کا کہہ کر گیا تھا اور بمشکل ایک ہفتہ رہ کر واپس لوٹ آیا تھا۔ اس کا متفکر رویہ اور کھوجتے انداز بھی مجھے متوجہ کر گئے اور پھر اس نے خود ہی ذکر چھیڑ دیا۔

"لالہ میں کیا سُن رہا ہوں، تم اور..... لڑکی؟"

"لڑکی؟" میں چونکا۔ "تمہارا مطلب ہے مومنہ۔"

"ہاں وہی۔ مجھے سوات تک اطلاع مل گئی تھی، مجھے یقین بھی نہیں آ رہا تھا کہ تمہارا نام کسی لڑکی اور وہ بھی کسی پہاڑی لڑکی کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ بہت کم عرصے میں کافی جان چکا ہوں تمہیں اور مجھے یقین ہے تم نے یونہی دن رنگین گزارنے کے لیے تو یہ کھیل شروع نہیں کیا ہوگا۔ یہ تمہاری فطرت میں ہی نہیں اور دوسری صورت میں..... یعنی اگر معاملہ سیریس ہے تو..... پھر"

"پھر.....؟" اس پھر تک تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

"پھر یہ کہ آگے کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ میں نے ایران چاچا سے تمام معلومات لی ہیں اس کے بارے میں۔ اگرچہ وہ وادی کے مذہب سے تعلق نہیں رکھتی، لیکن تمام لوگ اس کی بے حد عزت و تکریم کرتے ہیں۔ اس کے والد کے ان لوگوں پہ کافی احسانات ہیں اور وہ احسان فراموش لوگ ہرگز نہیں، اس لیے کسی قیمتی امانت کی طرح اسے سنبھال کر رکھا ہے۔ اس کے باپ کی وصیت کے مطابق اس کے ننھیال والے کسی مسلمان گھرانے میں ہی اس کی شادی کر سکتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بستی والے اور یہاں قصبے کے لوگ بھی کم ہی یقین کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہے، کافر قبیلے کے درمیان پرورش پانے کی وجہ سے اس پر کافر ہونے کا لیبل لگ چکا ہے۔ ایسے میں تمہارا سہارا دینا ان لوگوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہوگا۔ مشکل اگر کوئی پیش آئے گی تو وہ یقیناً تمہاری طرف سے ہوگی۔

پتہ نہیں تم اتنا بولڈ اسٹیپ لینے کی جرات کر پاتے ہو یا نہیں اور اگر کر بھی لیتے ہو تو یہ نہیں کہ تمہارا خاندان تمہارے اس فیصلے کو قبول کرنے میں کتنا وقت لیتا ہے۔ قبول کرتا بھی ہے یا نہیں؟ یہ بعد کی بات ہے پہلے تم فیصلہ کرو کہ تمہیں کیا کرنا ہے، تم کس حد تک انوالو ہو؟ اگر یہ محض وقتی جذبہ ہے اور تم خود میں اس کی خاطر سارے خاندان سے ٹکرانے کی ہمت نہیں پاتے تو میرا مخلصانہ مشورہ ہے اس تمام قصے کو یہیں دفن کرو اور میرے ساتھ واپس چلنے کی تیاری کرو۔ کیونکہ ایران چاچا کو ان کے قبیلے کے بڑوں نے میرے پاس بھیجا تھا اور اس اسٹیٹمنٹ کے ساتھ کہ عزت کے ساتھ لڑکی رخصت کرانی ہے تو باقاعدہ اس کے ماموں کے پاس رشتہ بھیجا جائے، ورنہ ساری مہمان نوازی اور خوش اخلاقی ایک طرف۔ اپنی بستی اور وہ بھی ایسی لڑکی جسے انہوں نے کسی مقدس امانت کی طرح رکھا ہو، اس کے ساتھ کھیل کھیلنے کی اجازت وہ نہیں دے سکتے۔"

اس کی طویل تقریر کے اختتام پہ میں نے لمبی سانس کھینچ کے کب سے تنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے۔

"بہت بہت شکریہ....."

"کس بات کا؟ خبردار کرنے کا۔" وہ میرے ردِعمل پہ حیران تھا۔

"نہیں میرے جذبوں کو ایک واضح صورت دینے کا۔ میرے قدموں کو ایک صحیح سمت موڑنے کا، اور یہ جو کئی دن سے ایک بے نام سی الجھن تھی میرے دل میں کہ اب کیا

Urdu.com
Babar
URDU PHOTO

ہوگا..... کیا کروں گا میں..... کیسے واپس جا پاؤں گا..... کیسے رہ سکوں گا اس کے بغیر.....
اس الجھن کا حل میرے سامنے پیش کرنے کا، بہت بہت شکریہ" میں کھل کر ہنسا۔

"ہاؤ اسٹوپڈ آئی ایم (کتنا احمق ہوں میں) اتنی سی بات تھی اور کبھی میرے ذہن میں آئی ہی نہیں۔"

"واقعی.....؟" فیروز تعجب سے بولا پھر قہقہہ مار کے ہنس پڑا۔

"کمال شے ہے تُو بھی یار از ریاب۔"

"اب راہ بھائی دے ہی گئی ہے تو میرا خیال ہے دیر نہیں کرنا چاہیے۔ کیا کل ہی چلیں بات کرنے؟" میں بے چینی سے کھڑا ہو گیا، جیسے اگلے قدم پہ ہی تو "کل" ہے۔ وہ کچھ سنجیدہ ہو گیا۔

"میرا مشورہ ہے کہ تم پہلے اپنے بزرگوں سے بات کر لو۔ شاید انہیں کچھ اعتراضات ہوں۔"

"شاید نہیں یقیناً وہ کبھی نہیں مانیں گے۔ کوئی فائدہ نہیں بات کرنے کا۔"

"پھر بھی..... بے شک تم اپنے فیصلے پہ قائم رہو..... اپنی مرضی سے ہر کام کرو..... لیکن رسمی طور پہ ہی سہی، تمہیں ان سے بات تو کرنی چاہیے۔ یہ عمر کی بات ہے۔ تم ہمیشہ کے لیے خاندان سے کٹ کے رہ سکتے ہو۔ [illegible] بیوی کو پوشیدہ رکھ سکتے ہو۔ [illegible] تم ان سے چھپا کے شادی کر بھی لی تو۔"

"میں چھپا کے شادی کر رہا ہوں، نہ چھپا کے بیوی کو رکھوں گا۔ ہاں میں فی الحال انہیں اطلاع دیے بغیر ان کی غیر موجودگی میں یہ شادی کر لوں گا۔ رسمی طور پہ بھی ان سے اجازت طلب کرنے کا مطلب ہے انہیں الرٹ کر دینا۔ جب ان کے انکار کے بعد بھی میں نے اپنی مرضی سے ہی شادی کرنی ہے تو ابھی کیوں نہیں، کم از کم ابھی [illegible] اندازی کا اندیشہ تو نہیں، لیکن اگر باچا جان اور بڑے لالہ کو بھنک بھی پڑ گئی تو وہ ہر ممکن کوشش کریں گے۔ مجھے اپنے فیصلے اور ارادے سے باز رکھنے کی اور پھر بی بی جان..... تم جانتے ہی ہو یہ خونی رشتوں کی ایموشنل بلیک میلنگ، میں بغیر کسی ذہنی دباؤ اور پریشانی کے اپنی زندگی کا یہ سنہرا دور شروع کرنا چاہتا ہوں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ کیا تم میری مدد کرو گے۔"

میں نے اچھی طرح اپنا نقطۂ نظر اس پہ واضح کرنے کے بعد اس کا تعاون طلب کیا تھا

اور جواباً اس نے پوری گرم جوشی کے ساتھ مجھے وسیع بازوؤں میں بھینچ لیا تھا۔

یکم جون ۱۹۸۰ء

مومنہ کا طرزِ عمل میرے لیے ناقابلِ فہم ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا وہ میری بات سن کے کھل جائے گی۔ اس کی آنکھوں میں تیرتے خوف کے سائے ناپید ہو جائیں گے اور دل میں اپنے بے یقین مستقبل کے حوالے سے بسے سوالوں کو جواب مل جائے گا۔ لیکن میری بات سُن کے اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے اور واضح ہو گئے۔ وہ یوں بدک کے اُچھلی جیسے میں نے اسے شادی کی پیش کش نہ کی ہو بلکہ آگ کے دریا میں کودنے کی دعوت دی ہو۔ اس کے دوٹوک انکار پہ میں بھڑک ہی تو گیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیوں نہیں شادی کر سکتیں تم مجھ سے، میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ کیا کمی ہے مجھ میں۔ اس لیے کہ کوئی بھی شخص خامیوں سے مبرّا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر تم ہر کمی اور خامی کے باوجود مجھ سے محبت کر سکتی ہو، تو شادی کیوں نہیں....."

"بس نہیں کر سکتی [illegible] بالکل نہیں کر سکتی۔" اس کے مسلسل نفی میں سر ہلانے پر غصے کے ساتھ ساتھ بے بسی نے بھی مجھے گھیر لیا۔

"میری مجبوری ہے کہ میں تمہاری محبت پر شک بھی نہیں کر سکتا۔ یہ بھی نہیں تصور کر سکتا کہ تم نے مجھ سے محبت کا ڈرامہ کیا، مجھ سے جھوٹے اقرار کیے، نہیں..... نہیں کیونکہ میں جانتا ہوں مومنہ ایسا نہیں کر سکتی، یہ چہرہ کسی کو دھوکا نہیں دے سکتا، یہ آنکھیں کوئی جھوٹ نہیں بول سکتیں۔"

اس لمحے شدت سے میرے دل میں خواہش اُبھری کہ میں اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کے اپنی آنکھوں میں جھانکنے پہ مجبور کروں، لیکن میں نے خود پہ قابو پایا اور دونوں زانوؤں کے روبرو بیٹھ کے عاجزی سے کہنے لگا۔

"مومنہ خدا کے لیے کچھ سوچو..... وہ کیا وجہ ہے، کون سی مجبوری ہے جو تمہیں اس شادی سے انکار پہ اُکسا رہی ہے۔" میرے بار بار کے اصرار پر وہ اپنے اندیشوں کو زبان دینے پہ تیار ہو گئی۔

"تمہیں بہت آسان لگ رہا ہے ناں یوں سارے خاندان سے کٹ کر مجھے اپنا لینا۔ سارے جہان سے ٹکر لے کر اپنی من مانی کرنا۔ ایک فرد کی محبت پانے کے لیے دوسرے تمام رشتوں کو ٹھکرا دینا اتنا ہی سہل نہیں۔ یہ جو تم بار بار کہہ رہے ہو۔" بعد میں

Urdu.com
UrduPhoto.com
Saba

دیکھیں گے اور بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس کی کیا ضمانت ہے تمہارے پاس۔ ہوسکتا ہے تمہارے پاس کچھ بھی نہ بچے، نہ ماں، نہ باپ، نہ بہن بھائی، نہ خاندان، نہ جائیداد۔"

"اور تم..... تم تو رہو گی ناں۔"

"فرض کرو میں بھی نہ رہی تو۔ ابا نے بھی ماں کے بھروسے سب کو چھوڑا۔ لیکن ماں کو تو زندگی نے بس چھ سال کی مہلت دی۔ اس کے بعد کیا رہا میرے ابا کے پاس۔ میری صورت میں ایک مستقل ذمہ داری اور بس..... میں نہیں چاہتی کل کو پھر سے تم اور میں اسی عذاب سے گزریں۔ اپنوں کی بے اعتنائی کا کرب سہیں۔ ماں کے پاس تو پھر بھی ابا کے تمام رشتے موجود تھے۔ میرا دامن تو خالی ہے۔ میں خود تہی داماں، تمہیں کیا دے سکوں گی۔"

"مجھے صرف تم چاہیے ہو مومنہ، صرف تم اور تمہارے لیے میں کوئی بھی نقصان اٹھانے کو تیار ہوں۔ تمہارا ساتھ میری زندگی کے لیے اتنی بڑی آسائش ہے کہ اس کے بعد مجھے کوئی خسارہ خسارہ نہیں لگے گا۔"

"اور میرے بارے میں کیا سوچا تم نے، میں تمہارے خسارے میں رہوں گی۔ کل بھی تہی داماں، آج بھی، اور آنے والے کل میں بھی میرے لیے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ تمہاری اور میری محبت آج بھی اتنی ہی تناور ہے، کسی رشتے کے بغیر بھی، ہماری شادی نہ بھی ہوئی، تم مجھے کبھی نہ بھی ملے تب بھی میرے دل میں تمہارے لیے وہی مقام رہے گا۔ تم دنیا کے کسی کونے میں بھی چلے جاؤ میں تمہاری یادوں میں زندہ رہوں گی۔ اس بات کا یقین ہے مجھے۔ پھر میں صرف محبت کے نام پہ تم سے شادی کیوں کروں۔

اگر مجھے کسی سے شادی کرنا ہوگی تو وہ ایسا شخص ہوگا جو مجھے ایک ہی رشتے سے متعارف نہیں کروائے گا، جو مجھے کسی کی بہو، کسی کی بھابھی بنائے گا، جو مجھے ایک بھرے پرے کنبے میں بسائے گا، مجھے وہ دے گا جس کی مجھے سب سے زیادہ ضرورت ہے اور پھر چاہے مجھے اس سے محبت ہو یا نہ ہو، وہ مجھے چاہے یا نہ چاہے۔ اگر شادی صرف ایک ہی بار ہوتی ہے تو میں اسی سے کروں گی۔ ورنہ بے نام و نشاں تو میں یہاں بھی ہوں، تمہارے ساتھ جا کے بے سائباں نہیں ہونا چاہتی۔"

"تو پھر میں تم سے عہد کرتا ہوں کہ مومنہ علی، ایک خٹک مرد تم سے وعدہ کرتا ہے کہ تم

پوری آن بان اور وقار کے ساتھ اس کے گھر جاؤ گی۔ چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔"

"تم مجھے آن بان اور وقار کے ساتھ وہاں لے تو جاؤ گے لیکن سب کو مجبور تو نہیں کر سکو گے کہ وہ میرے وقار کا احترام کریں۔ نہیں خان زبردستی تم مجھے ان کے سروں پہ تھوپ کے اور بھی بے توقیر کر دو گے۔ میں سب سہہ سکتی ہوں اپنی بے عزتی اور تذلیل نہیں۔"

اس کے لہجے میں سختی محسوس کر کے میں چپ کر گیا کہتا بھی کیا، میں ہر طرح کے بلند بانگ دعوے کر سکتا ہوں اور شاید ان پہ عمل بھی لیکن کیا میں واقعی باچا جان کی نظروں میں اسے مجھ کی حیثیت دلا سکتا ہوں؟ کیا اپنے خاندان والوں کو مجبور کر سکتا ہوں کہ وہ اسے خٹک فیملی کے باعزت فرد کی طرح محترم اور عزیز جانیں۔

ایک لمبی جنگ لڑنے کے بعد شاید میرے ماں باپ میری محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس شادی کو تسلیم کر لیں، مومنہ کو خٹک ہاؤس میں قدم رکھنے کی اجازت بھی مل جائے، لیکن وہ اتنے وسیع القلب ہرگز نہیں ہو سکتے کہ ایک کم نسب و کم حیثیت سی لڑکی کو گھر کے ساتھ ساتھ دل میں بھی جگہ دے دیں۔ مجھے چپ ہی رہنا تھا۔ میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کرنا چاہتا تھا جسے پورا کرنا میرے اختیار میں نہ ہو۔

۲ جون ۱۹۸۰ء

اس اذیت ناک رات کی تمام تر سفاکی میرے چہرے پہ رقم تھی۔ رت جگے اور تذبذب کے خون آشام سائے آنکھوں سے ہویدا تھے، پلکیں جھپکنے میں بھی سینکڑوں سال جیسے جھپ جاتے تھے۔ میری حالت دیکھ کے فیروز بے چین ہو گیا اس کے پُر خلوص استفسار پہ میں نے اپنا مسئلہ بیان کر دیا۔ وہی اپنے ارادے کی پختگی اور مومنہ کے انکار کے پس منظر میں موجود تمام تر اندیشے۔

"فیروز، وہ ایک بار میرا ساتھ دینے پہ تیار ہو جائے تو ہر مرحلہ خود بخود آسان ہو جائے گا۔ میں ایک دم سے اسے لے جا کے باچا جان کے سامنے نہیں کھڑا کر سکتا، نہ ہی وہ اسے اس طرح قبول کر لیں گے۔ وہ کم از کم مجھے اتنی مہلت تو دے کہ میں اپنا نام اس کے نام کے آگے لگا سکوں، مجھے اس کی ہمراہی کا اعتبار آ جائے تو میں تمام دنیا کا سامنا کر لوں گا۔ بس ایک بار وہ میری مان لے۔"

UrduPhoto.com
Saba

میں بے بسی سے نڈھال تھا، اس کا اچانک اٹھ کے جانا بھی محسوس نہیں کر سکا۔ چند گھنٹوں بعد جب وہ واپس آیا تو خوشی سے چہرہ گلنار تھا اور عجلت و بے تابی اس کی ہر حرکت سے عیاں تھی۔

''اُٹھو خان خاناں..... اُٹھو جان جاناں..... آؤ تمہیں بنائیں سنواریں..... جلدی کرو، کام زیادہ اور وقت کم ہے۔ پہلے تو یہ لٹکا ہوا چہرہ اصل حالت میں واپس لاؤ، پھر انجینئر خاں سے حجامت وغیرہ بنواؤ، کچھ شکل پہ رونق لاؤ۔ میرے یار کی بارات نکلنی ہے آج۔'' اس کی بے ربط گفتگو میری سمجھ سے باہر تھی۔

''کیا کہہ رہے ہو؟ کس کی بارات؟ کون سا یار؟'' وہ میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''میں گیا تھا مومنہ کے پاس، کچھ باتیں اس کی بھی سچ تھیں، اس کے اپنے اندیشے اپنی فکریں تھیں بڑی خود دار اور ناموس والی لڑکی ہے۔ ایک بختون زادے کو اور کیا چاہیے۔ ایسی شریک حیات جو آن بان اور شان میں اصلی ہو۔''

وہ نجانے اور کتنی دیر مومنہ کے قصیدے پڑھتا کہ میں نے ٹوک دیا۔

''تمہاری بات کیا ہوئی اس سے، مجھے یہ بتاؤ۔''

''قصہ مختصر یہ کہ وہ تم سے شادی پہ تیار ہے۔'' اس نے بالکل ہی حتمی بات کہہ دی ،جب کہ میں اس کی تفصیل جاننے پہ بے تاب۔

''اوہو مگر یہ ہوا کیسے، تم نے کیا کہا اس سے؟''

''اسے اعتماد دیا ہے، جس سے اس کی ذات ناآشنا تھی۔ اسے وہ رشتہ دیا ہے جس کے سہارے وہ اپنے قدم مضبوطی سے جما سکتی ہے۔ یار عورت بڑی عجیب چیز ہے۔ محبت کے بارے میں بڑی حرص ہے اس کے اندر، چاہتی ہے [illegible] جائے اور پھر مومنہ جیسی عورت جس سے قدرت نے ہر رشتہ چھین لیا تھا۔ اس کے اندر تو یہ طلب اور بھڑکی ہوئی تھی۔ میں اس سے تیرا یار بن کے ملنے گیا تھا لیکن اسے بہن بنا کے آ رہا ہوں۔

اور پھر وہ اپنی ذات اور تقدس کے حوالے سے بے حد حساس ہے بڑے بڑے خراب حالات اور نامساعد ماحول میں بھی اس نے خود کو سنبھال کے رکھا ہے۔ اپنی پاکیزگی، اپنے ایمان پہ غرور کی حد تک ناز ہے اسے۔ وہ نہیں چاہتی کہ کوئی بھی اسے یا اس کے کردار کو نشانہ بنائے۔ جب کہ تمہارے اپنی پسند کی شادی کر لینے کی صورت میں کم از کم

تمہارے گھر والوں سے تو اسے یہ طعنے سننے ہی پڑیں گے۔ اس کا حل بھی میں نے سوچ لیا ہے۔ تمہارا نکاح ابھی اسی وقت قصبے کی مسجد میں ہوگا۔ صبح ہم سب سیدو شریف روانہ ہوں گے اور میری حویلی سے مومنہ رخصت ہوگی۔ تب جب تم اپنے والد یا بھائی کے ساتھ اسے لینے آؤ گے۔ یہ بات طے ہو چکی ہے اور اس سلسلے میں تم کوئی اعتراض نہیں کرو گے۔''

''لیکن تم نے یہ فیصلہ.....''

''صرف اور صرف اپنی بہن کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ اس کے کردار و مقام پہ کوئی حرف نہیں آئے گا اور اپنے یار کو اس کی تمام خوشیاں دلانے کے لیے مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ اچھا اب تفتیش کرنا بند کرو اور اُٹھ کر ڈھنگ کے کوئی کپڑے پہن لو، اگر ہیں تو.....'' اس نے مجھے بازو سے پکڑ کے اُٹھایا۔

میں..... میری تو وہ حالت تھی کہ میں اس کا شکریہ تک ادا نہیں کر سکا اور اچھا ہی ہوا۔ بھلا الفاظ اس کی محبت اور خلوص کا حق ادا کر سکتے تھے۔ میں خوشی سے گنگ تھا جب کہ مسرتیں اظہار کے لیے بے تاب، اسی لیے فوراً تم سے اے میری ڈائری، تم سے اپنی خوشی شیئر کرنے بیٹھ گیا۔ جب کہ آتے جاتے مختلف انتظامات میں مصروف فیروز کی پکار مجھے بار بار ڈسٹرب کر رہی ہے۔

۳ جون ۱۹۸۰ء

اور بالآخر مومنہ علی، مومنہ زریاب خٹک بن ہی گئی۔ چاہے کسی بھی طرح ہوئی مگر یہ شادی [illegible] مومنہ کی ضد کہ میرے گھر والے خود اسے رخصت کرانے آئیں اور میری مجبوری کہ یا چاچا جان کسی صورت بھی کافرستان اپنے بیٹے کی دلہن ڈھونڈنے نہیں آ سکتے تھے [illegible] کافرستان سے اسے بغیر کسی تعلق کے میں لے جا نہیں سکتا تھا۔ یہ شادی یونہی ہونی تھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں شہد کی دو جھیلوں کو بس پیاسا ہی تکتا رہوں۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کی مٹھاس سے میرے لب سیراب ہوں۔ یہ شادی یونہی کیوں ہوئی تھی؟ کیوں؟ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ خان ارباب خٹک کا سب سے لائق فائق اور لاڈلا بیٹا خان زریاب خٹک، سرحد کے مشہور خانوادے کا چشم و چراغ سینکڑوں میل پہ پھیلی اراضی اور کروڑوں کی جائیداد کا وارث، اپنی بارات میں چند پہاڑی لوگوں کی ٹولی لے کر مانگے کا شلوار سوٹ پہن کر پیدل، کافرستان کی بستی میں تنگ گلی کے آخری کونے پہ موجود لکڑی اور پتھروں سے بنے اس دو منزلہ مکان تک چل کے جائے گا۔

urdu.net
URDU PHOTO

دروازے پہ موجود چند بزرگ عورتوں نے میرا استقبال کیا اور میرے گلے میں خشک میوہ جات سے پرویا ہوا ایک ہار ڈال کر خیر مقدمی گیت گائے۔ گھر کے کچے احاطے میں کئی بچیاں تالیاں پیٹ پیٹ کے بے حال ہو رہی تھیں۔ نکاح مسجد میں ہو چکا تھا۔ مومنہ کے ماموں اور خالہ چونکہ مسجد تک نہیں آ سکتے تھے اس لیے ان کی خوشی کے لیے میں خود چل کے یہاں تک آیا تھا، تاکہ وہ اپنے رسوم و قواعد کے مطابق اسے رخصت کریں۔ لیکن مجھے اندازہ نہ تھا کہ یہ رسمیں اس قدر فضول اور بے زار کن ہوں گی۔ خصوصاً اس وقت تو میں جھلا گیا جب میرے ہی پاؤں کے موزے اتروا کے انہیں جلانے کے بعد مجھے دھونی دی گئی۔ میرے چہرے پہ ناگواری محسوس کر کے ایران چاچا نے بتایا۔

"بچہ یہ تمہاری نظر اتارتا ہے۔ جب دو محبت کرنے والے ایک ہو جاتے ہیں تو ان لوگوں کی رُوحیں تڑپ جاتی ہیں۔ جنہیں دنیا میں اپنی محبت نصیب نہیں ہوتی۔ ان کے حسد اور نظر بد سے بچانے کے لیے یہ اماں تمہیں دھونی دے رہی ہے۔"

اور کوئی یقین نہیں کرے گا، کہ میں..... جی ہاں میں حاسدوں کے خوف سے دبک کے بیٹھ گیا اور چپ چاپ نظر اتروانے لگا۔

کون کہتا ہے محبت دلیر ہوتی ہے۔ جی نہیں محبت تو بزدل ہوتی ہے۔ ذرا سے خطرے کو محسوس کر کے سہم جاتی ہے۔

☆☆☆

خان زریاب خٹک۔

مومنہ علی۔

اور.....

فیروز وردگ۔

ایک سیدھی سادی کہانی کے آسان فہم سے کردار۔

پھر ابہام کہاں ہے؟ الجھاؤ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟

شاید تب جب باچا جان کو بابا کے اس جرات مندانہ اقدام کی خبر ملی ہوگی۔ یا تب جب بابا جان مما کو لے کر یہاں آئے ہوں گے۔ لیکن تب، اس وقت فیروز وردگ کا کیا کردار رہ جاتا ہوگا اس ساری کہانی میں، کیوں ان کا نام اب بھی بابا جان کے حوالے سے اس قدر خوف و ہراس کے ساتھ لیا جا رہا ہے..... کیوں؟ آخر کیوں؟

مقدس پہ جان لینے کی بے تابی سوار تھی۔ لیکن ساتھ ساتھ ہی تحریر کا جادو بھی اسے جکڑ رہا تھا، وہ اپنے ماں باپ کے ہمراہ ان تمام احساسات کو خود پہ گزرتا دیکھ رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک ایک سطر پڑھنے پہ مجبور تھی۔ ورنہ شاید دل تو اس کا ڈائری کے اختتامی صفحات میں اٹکا ہوا تھا۔

☆☆☆

ایک دھڑکتا ہوا سا سناٹا پھیلا ہوا تھا پورے کمرے میں صرف باچا جان کی اکھڑی اور دشوار سانسوں کی آمد و رفت کا شور تھا یا پھر بی بی جان کی دبی دبی سسکیوں کی مدھم آوازیں۔ ضبط گریہ سے ان کی بلوریں آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ سفید پُر جلال چہرے پہ زردی کھنڈی تھی اور دانتوں سے سختی کے ساتھ بھینچے لب سسکیاں روکنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ خان افراسیاب خٹک نے یکدم اٹھ کر کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اب مزید خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ خان دراب خٹک نے بھی ڈاکٹر کی تازہ ترین رپورٹ کو دسویں بار پڑھنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے بھائی کو دیکھنا شروع کر دیا کہ کب وہ اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ تیسری بار بی بی جان کے سامنے گزرتے ہوئے وہ اچانک پلٹنے اور والد محترم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

"آپ کی وجہ سے باچا جان..... صرف اور صرف آپ کی وجہ سے زریاب کا یہ حال ہوا ہے اور اس کے بے حال ہونے کی وجہ سے آج ہم سب کی حالت دگرگوں ہے۔ ہر چیز کے ذمہ دار آپ ہیں۔ آپ ہی ہیں اس کی ہر فضول حرکت اور بے کار مشاغل کو بڑھاوا دینے والے۔ اس کے ہر روایت شکن اقدام سے چشم پوشی کرنے والے اور اس کی ہر ضد اور خواہش کے آگے کمزور پڑنے والے۔"

خان ارباب خٹک کے ناتواں اور جھریوں بھرے چہرے پہ موجود آنکھیں حیرت سے پوری طرح کھل گئیں۔ اپنی پوری زندگی میں انہوں نے بلاشبہ پہلی بار کسی کی اتنی اونچی آواز سنی تھی۔ پہلی بار کوئی ان کے سامنے ان کے جرم گنوا رہا تھا اور انگلی اٹھانے والا کوئی اور نہیں ان کا اپنا بیٹا، ان کا بڑا بیٹا خان افراسیاب خٹک تھا۔

غم و غصے کی شدت سے ان کی رگیں اُبھر آئیں اور سانس گویا چند لمحوں کے لیے ڈوب ہی گئی۔ بی بی جان تڑپ کے اٹھیں لیکن ان سے پہلے ہی دراب نے لپک کر آکسیجن کی پائپ سیٹ کر دی۔ وہ وہیں اپنے خان کے سرہانے کھڑی تسبیح کے دانے

Babaurdu.com
URDU PHOTO

گرانے لگیں۔ دراب نے باچا جان کے ہاتھ سہلاتے ہوئے بڑے بھائی کو ملامتی نظروں سے گھورا۔

"بڑے لالہ، پلیز اپنے آپ پر کنٹرول کیجیے۔ باچا جان کی حالت ایسی ہرگز نہیں کہ وہ آپ کی تند و تیز باتیں سہہ سکیں۔"

"باپ بستر پہ ہے، لاغر ہے، مجبور ہے، بے بس ہے مگر۔۔۔" بی بی جان نے بھی برستی آنکھوں سے بڑے فرزند کو دیکھا۔

"مت بھولو کہ وہ تمہارا باپ ہے۔ اپنے بڑوں سے اس طرح پیش آنا تو ہم نے تمہیں نہیں سکھایا افراسیاب۔"

"یہ ہی تو رونا ہے آپ نے جو کچھ سکھانا تھا بس مجھے زرسانگہ اور دراب کو سکھایا سارے حدود و قیود کا احترام، بزرگوں اور ان کی مرضی کو ہر حال میں مقدم جاننا، خاندانی حُرمت و ناموس کو بتایا ہر چیز پر اولیت دینا..... کاش..... کاش..... زریاب کو بھی کچھ سکھایا ہوتا۔ لیکن اسے یہاں رہنے کا موقع ہی کب ملا۔ وہ یہاں رہتا تو اسے اپنی روایات و خاندان سے انس بھی ہوتا۔ باچا جان کی طرف سے اسے کھلی چھوٹ مل گئی تھی، بنجارہ بن گیا تھا وہ..... نگر نگر گھومنے والا..... اور بنجارن ہی اُٹھا لایا گھر میں۔"

"لالہ کی طبیعت میں ہی ٹھہراؤ نہیں تھا۔ یہ جاگیر اور قواعد و پابندیاں سب ان کی فطرت سے بہت دور کی چیزیں تھیں۔ اس میں باچا جان یا بی بی جان کی تربیت کو موردِ الزام ٹھہرانا غلط ہے۔" دراب نے کہا۔

"اولاد کو لگام ڈالنا تو فرض ہے ماں باپ کا اور ایسی کی تیسی ایسی فطرت اور طبیعت کی جو اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کی بھی زندگیاں داؤ پر لگا [illegible] غضب دبانے پہ تیار نہ تھے۔

"نہ اس کی سوچ بے لگام ہوتی، نہ وہ گھر سے بے زار ہو کر بھٹکتا پھرتا، نہ فیروز جیسے گمراہ کر دینے والے یاروں دوستوں کے چنگل میں پھنستا اور نہ وہ کافرستان کی پہاڑن اسے ملتی..... اور اگر یہ سب ہونا ہی تھا، ہو ہی چکا تھا تو کیا ضرورت تھی باچا جان کو اس طرح اس کے آگے ہار مان لینے کی، کیوں بھاگ گئے تھے اس کی پسند کو اپنانے کے لیے۔ کیوں اس کی ناخلفی اور نافرمانی کو نظر انداز کر کے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

ماں باپ کی اجازت کے بغیر انہیں بے خبر رکھ کے ایک حقیر اور بے مایہ لڑکی سے

نکاح کر لینا اتنا قابل معافی جرم نہیں تھا۔ انہیں چاہیے تھا اسے قید میں ڈلوا دیتے۔ لڑکی کو مروا کے کالام ہی کے پہاڑوں میں پھنکوا دیتے۔ عشق کا چند روزہ بخار اُتر ہی جانا تھا ایک دن۔"

"بعض جادو سر چڑھ کے بولتے ہیں۔" بی بی جان نے سرد آہ بھری۔

"اپنی ہی اولاد کو خود اذیت دینا آسان کام نہیں۔ اس لڑکی کو مروانا ناممکن نہیں تھا لیکن تم نہیں جانتے اس وقت زریاب کا جنون کس درجے کا تھا، اسے کھو دینے کے ڈر سے خان جی اس لڑکی کا بال بھی بیکا نہ کر سکے مگر یقین کرو انہوں نے ہر ممکن کوشش کی تھی اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی۔ لاتعلقی اختیار کرنے کی دھمکی بھی دی اور عاق کر دینے کا ڈراوا بھی لیکن سب بے سود۔ وہ پہلے ہی ہر چیز سے بے زاری ظاہر کرتے ہوئے چھوڑ دینے پہ تیار تھا۔ خان جی اس کی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو گئے تھے۔ تم ایک باپ ہو، باپ کی مجبوری جان سکتے ہو۔" انہوں نے شوہر کی طرف سے صفائی پیش کی۔

"میں صرف ایک باپ ہی نہیں۔ ایک بھائی بھی ہوں۔" افراسیاب تھکے تھکے انداز میں کرسی پہ گر گئے۔ ان کے انداز سے بے چارگی ظاہر تھی اور آواز میں شکستگی۔

"اس کی جوانی برباد ہونے کا غم کیا مجھے نہیں ہوگا۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ پچھلے بیس سال اس گھر کے کسی بھی فرد نے پرسکون گزارے ہیں۔ کون ہے جو رات کو انگاروں پہ نہیں لوٹتا ہوگا یہ سوچ کر کہ خان زریاب خٹک جیسا نفیس اور حسین شہزادہ....." دراب کی آنکھوں میں پھیلی نمی ان کے قیاس کی تائید کر رہی تھی۔

"میں صرف باپ ہی نہیں..... ایک بھائی بھی ہوں، ایک بیٹا بھی ہوں..... یہ بے [illegible] کرتی رہی کہ میں اتنا اثر و رسوخ رکھتے ہوئے بھی اپنے باپ کے سینے میں ٹھنڈک [illegible] پیدا کر سکتا۔ جب میں اور دراب ان کے آگے کھڑے ہوتے ہیں تو ان کی نگاہیں ہمارے پہلو میں کس کو تلاشتی ہیں کیا میں نہیں جانتا۔..... اور اب..... جب ان کی برسوں کی امیدیں پوری ہونے والی ہیں تو یہ فیروز کا مسئلہ..... وردگ خاندان اس کی تاک لگائے بیٹھا ہے۔" وہ انتہائی بے بسی کے عالم میں مٹھیاں کھول اور بھینچ رہے تھے۔

"اسی لیے رہ رہ کے مجھے بس یہ خیال آتا ہے کہ کاش اس وقت ہی اس مصیبت کا سدِ باب ہو گیا ہوتا۔ اس نے نکاح کر ہی لیا تھا تو کم از کم اس کی اس حرکت پہ خاموشی سے ہتھیار نہیں ڈال دینے چاہیے تھے۔ اس ذلیل عورت کو کھلی چھوٹ دے دی ہم لوگوں نے

Urdu.com
Saba URDU PHOTO

زریاب کی زندگی سے کھیلنے کی۔"

"گزرے وقت کو کوسنے سے کیا فائدہ لالہ۔ آپ بس اب کسی طرح کچھ ایسے انتظامات کریں کہ زریاب لالہ کو فوراً یورپ، یا اسٹیٹس بھیجا جا سکے۔"

"ہوں..... کچھ ایسا ہی سوچ رہا ہوں میں بھی۔"

☆☆☆

وہ لے جاتا ہے سورج مجھ سے جینے کی سکت
رات بھر بن بن کے دن بھر ٹوٹتا رہتا ہوں میں
وقت کی آندھی سے کھل کھل جاتی ہے میری گرہ
خود کو کس کس کے ہر وقت باندھتا رہتا ہوں میں

ہر دن پہلے سے کہیں بڑھ کے بیزار کن اور ہر رات پہلے سے کہیں بڑھ کے طویل تر۔ ہر صبح کا سورج اپنے ہمراہ نیزے چبھوتی اذیتیں پھیلاتا ہے اور ہر شام کی پھیلتی تاریکی کے جلو میں ڈھیروں ڈھیروں یادوں کے تارے ہوتے ہیں۔

یادیں۔
جو اور بھی نڈھال کر دیتی ہیں
یادیں.....
جو اور بھی تنہا کر دیتی ہیں۔

کاش ایسا ہو کہ کسی روز سورج نکلے، مگر اسے میرے جلتے بلتے وجود کی پرچھائیں بھی نہ ملیں سارا دن میرا تماشا دیکھنے والا شرمندگی سے اپنی ہی حدت میں آغوش میں منہ چھپا لے کاش ایسا ہو۔

کاش ایسا ہو کہ کسی روز شام ڈھلے مگر اس کی تاریکی کا ساتھ دینے کے لیے اسے یاد نہ ملوں۔ یادیں..... ان بوسیدہ دیواروں سے ٹکریں مارتی پھریں لیکن اس دل و دماغ تک پہنچنے والے تمام رستے اندھے ہو چکے ہوں، جہاں ہر رات یہ یادیں دھاوا بولتی ہیں۔ کاش..... کاش..... آہ.....

لمبی سرد آہ کھینچتے ہی اس کی سانس پھر سے اکھڑ گئی، اس نے پورا منہ کھول کے اس مختصر سی چار دیواری میں موجود کثیف سی فضا سے زندگی کھینچنے کی کوشش کی، لیکن جیسے سانس کے تمام رستے تنگ پڑ چکے تھے۔ سینہ دھونکنی کی طرح چلنے لگا اور حلق سے عجیب آوازیں

نکلنے لگیں اس نے اپنا اوندھا سیدھا وجود بمشکل کھڑا کیا اور دیوار کے ٹھنڈے لمس کا سہارا لے کر سیدھا بالکل سیدھا کھڑا ہو کے سر اونچا کر کے سانس ہموار کرنے لگا۔

اپنے آپ سے ہم سخن رہنا
ہم نشیں، سانس اُکھڑ جاتی ہے

☆☆

اور یہ آخری چند صفحات

مقدس نے چونک کے ضخیم ڈائری اور پھر وال کلاک کی جانب دیکھا۔

"آج سے پہلے میں کس قدر انجان تھی، کچھ بھی تو نہ جانتی تھی، کہاں ہیں میرے بابا جان..... کیسی ہیں میری مما..... کون ہیں وہ.....

اور آج ایک ایک نقش جیسے میرے دل پہ نقش ہے اس حسین چہرے کا..... وہ چہرہ جو میری ماں کا ہے۔

اور آج جیسے میں دل کے اندر تک اُتر چکی ہوں..... اس کے دل کے اندر..... جو میرے باپ کا ہے۔

کتنا انوکھا تجربہ ہے یہ بھی ان احساسات کو لفظ بہ لفظ پڑھنا، محسوس کرنا۔

ان تجربات کی گہرائی سے گزرنا۔ وہی امید و بیم کی کیفیات، وہی انتظار کی بے تابیاں، وہی اظہار کی شدتیں..... وہی کرب کے عالم..... ہر چیز میں نے خود محسوس کی ہے۔ ہر چیز میں، میں خود شامل ہوں۔

وہ میرے کسی جذبے، کسی احساس، کسی تجربے میں شامل نہیں۔ اس دُکھ کا کچھ مداوا تو ہو جائے ناں۔

اور یہ آخری چند صفحات۔

نجانے یہ کون سی کہانی سنائیں۔ شاید انہیں میں وہ راز قید ہو، وہ بھید دفن ہو، شاید یہی مجھے میرے ماں باپ کا سراغ دے جائیں۔"

اس نے ایک امید کے سہارے تھکی ہوئی آنکھوں کو پھر سے پڑھنے پہ آمادہ کیا۔ اگرچہ اس ڈائری کے مطالعہ کے دوران وہ کچھ اس طرح کھو گئی تھی کہ یہ بات ذہن سے نکل ہی گئی کہ وہ اصل میں کیا جاننا چاہتی ہے، لیکن اب آخری دو تین صفحات نے اس کی بے چینی پھر سے بڑھا دی تھی۔ یہ ڈائری ہی وہ واحد ذریعہ تھی جس سے وہ اتنا کچھ جان پائی

UrduPhoto.com
Saba
urdu.com

تھی اور یہی ڈائری وہ واحد ذریعہ ہے جو اس کو اپنے باپ کا سراغ بھی دے سکتی تھی۔

وہ یہ تو جان ہی چکی تھی کہ شادی کے بعد بابا جان کو کتنا وقت لگا باچا جان کو رضامند کرنے میں اور کیا کیا دھمکیاں دے کر انہوں نے بی بی جان کو مجبور کیا تایا جان کی ناراضگی کا ذکر بھی تھا اور پھوپھی جان کی برہمی کا بھی۔ مما کے اندیشے بھی بیان کیے گئے تھے اور ان تمام واقعات کا بھی سرسری سا ذکر تھا جو شادی کے بعد حویلی میں پہلی بار آنے پر پیش آئے تھے۔

باچا جان نے ناپسندیدہ بہو کو تسلیم کرنے کے لیے بابا جان کی آوارگی خرید لی تھی۔ ان کے سیر و سیاحت کی شوق پہ پابندی لگا کر کاروبار میں شریک ہونے کی شرط رکھی تھی۔ یہ بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اپنی پسند کو زبردستی تسلیم کروانے کے باوجود بابا جان انہیں گھر کے افراد کے دل میں جگہ دینے سے قاصر رہے تھے لیکن ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ خوشگوار شب و روز کا تذکرہ یہ بھی ظاہر کرتا تھا کہ اہلِ خانہ کے کھنچے کھنچے رویے اور ناراضگی کے باوجود دونوں مطمئن اور شاد تھے اگرچہ اب ڈائری میں خاصی بے قاعدگی آ گئی تھی، کہیں چار روز تو کہیں دو ہفتے کے وقفے سے لکھی گئی تھی لیکن کہیں سے بھی دونوں کے مابین ہلکی پھلکی سی چپقلش اور ناچاقی کا ذکر نہیں ملتا تھا۔ وہ حیران تھی کہ اتنی انڈر اسٹینڈنگ کے بعد آخر وہ کیا بات تھی جس نے یکا یک دونوں کے راستے الگ کر دیے۔ اس نے ڈائری پر نظر جمائی۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۸۱ء

مجھے یقین نہیں آتا کہ میں پورے ڈیڑھ سال بعد ڈائری لکھ رہا ہوں۔ مومنہ کے ساتھ نے میرے اندر بسی تنہائیوں کو یکسر ختم کر ڈالا ہے اور اب مجھے اپنے احساسات و جذبات بیان کرنے کے لیے کاغذ کے بے جان ٹکڑوں کی ضرورت نہیں رہی۔ میں نے خود کو ہمیشہ اس خاندان میں مس فٹ محسوس کیا۔

اپنے تمام لوگوں سے محبت کرنے کے باوجود بھی ذہنی طور پر میں خود کو ان سے بہت فاصلے پہ پاتا تھا۔ چلو بی بی جان، زرسانگہ باجی وغیرہ سے ذہنی مطابقت نہ ہونے کی ایک وجہ تعلیم بھی ہو سکتی تھی، وہ گھر کی دیواروں میں قید رہنے والی خواتین تھیں اور ظاہر ہے کہ ان کی ذہنی سطح بھی اس درجہ کی ہی تھی۔ ان کے ساتھ بیٹھ کے میں ہمیشہ ہی خاندانی جھگڑوں کی تفصیل اور رشتوں کے تانے بانے سن سن کے بور ہوتا تھا۔

میرا دل کرتا میں زرسانگہ باجی کے پاس بیٹھ کے انہیں وہ تمام واقعات سناؤں جو مجھے اپنے پچھلے سفر میں پیش آئے تھے اپنی آنکھوں سے انہیں دنیا کی سیر کراؤں لیکن ان کے پاس اپنی سہیلیوں اور کزنز کے جہیزوں اور رشتوں کے حاسدانہ تذکروں کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ اور بڑے لالہ..... ان سے میں محبت کرتا ہوں لیکن احترام کے ساتھ ..... وہی احترام جو مجھے باچا جان سے قریب نہیں ہونے دیتا وہی احترام میرے اور لالہ کے درمیان بھی حائل ہے۔ اسی لیے میں نے سوچ رکھا ہے کہ میں اپنے اور اپنی اولاد کے درمیان ایسا کوئی رعب و دبدبہ نہیں رکھوں گا کہ کھل کے محبت کا اظہار بھی نہ کر پائیں گے ہم ایک دوسرے سے، پھر آخر داب کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ وہ مجھ سے چھوٹا بھی ہے، ہارورڈ میں پڑھتا ہے۔ پھر کیوں نہیں ہمارے مزاج ملتے۔ کبھی کبھی تعلیم بھی انسان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ہارورڈ سے آنے کے بعد وہ یہاں مرغوں اور بازوں کی لڑائیوں کے کھیل کھیلتا ہے، جنگلی سوروں کا شکار کرتا ہے، باچا جان کی شوقیہ دشمن داریوں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتا ہے اور پھر چھٹیاں ختم ہوتے ہی تعلیم میں مگن ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے ہم تینوں بھائیوں میں سے وہی اصل خانزادہ ہے کہ باچا جان کے بقول اس کے تیور ہی اصل نسل خانوں والے ہیں۔ اگر ہر وقت بندوق اٹھائے رکھنا، سنگلاخ پہاڑوں پہ خاک اڑائے پھرنا اور پر ہیبت جنگلوں میں واہیات قسم کے جانور شکار کرتے پھرنا ہی خان ہونے کی شان ہے تو میں باز آیا ایسی سرداری سے۔ مجھے تو [illegible] سے رنگ، خوشبو اور فضا اٹریکٹ کرتی رہی۔ جہاں جہاں رنگ نظر آئے میں چرانے گیا۔ جہاں سے خوشبو آئی میں اس کے تعاقب میں بھاگا اور ایسے میں صرف یہ ڈائری ہی تو تھی جو میرے ہر تجربے میں شریک تھی۔

پھر مومنہ آئی..... اور میں جو سوچے بیٹھا تھا کہ خاندان کی کسی لڑکی سے شادی نہیں کروں گا چاہے زندگی بھر کنوارہ ہی کیوں نہ رہنا پڑے، کیونکہ کسی میٹرک پاس سے میری ذہنی مطابقت ہرگز نہیں ہو سکتی تھی اور لڑکی بھی وہ جو پشاور سے آگے صرف چارسدہ اور نوشہرہ تک گئی ہو۔ وہ میرے پر لگے وجود کا ساتھ کہاں تک دے پائے گی..... لیکن مومنہ..... اس نے میرے سارے تجربات غلط ثابت کر دیے۔ میں جان گیا کہ ذہنی مطابقت کے لیے تعلیمی سطح کا یکساں ہونا ضروری نہیں اور وہ لڑکی جو میٹرک تو کیا پانچ جماعتیں بھی نہ پڑھی ہوئی تھی..... جو اس بیضوی وادی کے چاروں طرف کھڑے پہاڑوں سے باہر کی دنیا

URDU PHOTO

کو بالکل بھی نہیں جانتی تھی۔ وہ لڑکی میری سب سے قریبی ہستی بن گئی۔ میں اسے اپنی روح کے اندر محسوس کرنے لگا۔ اسے اپنے ذہن میں روشن دیکھنے لگا اور دل کے اندر دھڑکتا سننے لگا..... پھر..... پھر کیسے میں اسے کھو دیتا۔ مجھے اسے پانا ہی تھا چاہے اس کے لیے مجھے سب کچھ کھونا پڑتا یہ میں نے خود سے وعدہ کیا تھا۔ لیکن شکر ہے کہ مجھے کچھ کھونا نہیں پڑا۔

اسے اس حویلی میں لانے کے لیے کچھ مشکلات تو پیش آئیں لیکن بہت جلد سب کچھ صحیح ہو گیا۔ اگر میں نے کچھ کھویا تو محض اپنی آزادی۔ باچا جان نے میری خواہش کے بدلے میری آزادی طلب کی تھی اور تب میں نے سوچا تھا کہ میں بہت بڑی قیمت چکا رہا ہوں۔ اب سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے، کاش باچا جان آپ نے کچھ اور مانگ لیا ہوتا۔ یہ صحرا نوردی تو یوں بھی ختم ہونا ہی تھی۔ مہینوں بعد جب کبھی گھر لوٹتا تھا تو باچا جان کے سینے سے لگ کے ٹھنڈک سی اُتر جاتی تھی وجود میں، بی بی جان کے ماتھے کے بوسے پرسکون کر دیتے تھے لیکن کچھ ایسا نہ تھا جو مجھے رکنے پہ مجبور کرتا۔ چند ہی دنوں بعد میں پھر سے نئے سفر پہ جانے کے لیے کمر کس لیتا۔ اب احساس ہوتا ہے کہ پاؤں میں بیڑیاں کیسے ڈلتی ہیں۔

میرا سب کچھ تو یہاں ہے اس حویلی میں پھر سمندر پار کیا ڈھونڈنے جاؤں گا۔ شاید وہی تھی جس کی تلاش نے مجھے دنیا کھنگالنے پہ اُکسایا اور ہاں اک اور تحفہ، مقدس اس کے آنے کے بعد تو اب کاروبار میں بھی دل نہیں لگتا، پہلے ہی خاصی مشکل سے دل و دماغ دونوں کو اس جانب راغب کیا تھا لیکن اس کے ننھے منے ہاتھوں کی گرفت سے اپنی انگلی چھڑا کے گھر سے نکلنا کس قدر دشوار لگتا ہے۔ پھر بھی..... نکلنا تو پڑے گا۔ یہ وقت میں بری طرح مشغول ہو جانے کے باعث لالہ کا رجحان کاروبار کی طرف کم ہی ہو گیا تھا اور میرے دلچسپی لینے کے بعد تو ان کا عمل دخل بس برائے نام ہی رہ گیا ہے۔ باچا جان کا بلڈ پریشر بھی بہت ہائی رہنے لگا ہے، جاپان جانا بھی ضروری ہے ورنہ ایک بڑی ڈیل ہونے سے رہ جائے گی۔ مومنہ کو شادی کے بعد پہلی بار تنہا چھوڑ کے جا رہا ہوں میری سوچ کے برعکس وہ خاصی پر ہمت نظر آ رہی ہے اور مسلسل مجھے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس دلا رہی ہے کل ہی میری فلائیٹ ہے اسلام آباد کی وہاں سے میں تقریباً بیس روز کے لیے جاپان روانہ ہو جاؤں گا۔"

ڈائری ختم ہو چکی تھی اور مقدس بری طرح الجھ گئی۔ ڈائری اُٹھانے سے قبل اس نے اچھی طرح یہ تسلی کرا لی تھی کہ یہ وہاں موجود ڈائریوں میں سے آخری لکھی گئی ڈائری تھی۔

"تو کیا ان کے جاپان جانے کے بعد کچھ ہوا تھا۔ کیا واقعی وہ سب ہوا تھا جو بی بی جان اور چچی جان کہتی ہیں کہ مما نے بابا کی عدم موجودگی میں کسی اور سے..... نہیں نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ ڈائری پڑھنے سے قبل میں نے بھی یہ فرض کر رکھا تھا کہ واقعی میری مما غیر ملکی اور غیر مسلم ہونے کی وجہ سے آزاد روش رکھتی ہوں گی۔ حویلی کی رسموں کو انہوں نے قبول نہیں کیا ہوگا اور اپنے لیے کوئی دوسرا راستہ چن لیا ہوگا اور اسی بات پہ دل برداشتہ ہو کر بابا جان یہ ملک چھوڑ کے چلے گئے ہوں گے۔ لیکن..... یہ ڈائری تو کوئی اور کہانی سناتی ہے۔

میری مما نہ تو غیر مسلم ہیں اور نہ ہی غیر ملکی..... نہ یہودی نہ عیسائی، نہ ہی جرمن نہ فرنچ ان کا "مومنہ" ہونا ہی تو بابا جان کو چونکا گیا تھا اور انہوں نے ہر ہر صفحے پر ان کی پاکیزگی کا عقیدت بھرے انداز میں ذکر کیا ہے۔ اب تو میں مر کے بھی یہ تصور نہیں کر سکتی کہ وہ کبھی بابا کو دھوکا بھی دے سکتی ہیں۔..... پھر..... پھر کیا وجہ تھی..... کیا ہوا تھا ان کی غیر موجودگی میں..... کیوں نہیں وہ واپس لوٹے.....؟

یہ وہ سوال تھے جواب بھی باقی تھے اور ایک سوال یہ بھی۔

"کیا میری یاد نے بھی انہیں واپس لوٹنے پہ مجبور نہیں کیا؟" اسے ان آخری صفحات سے پڑھنا شروع کیا لکھی وہ تحریر یاد آنے لگی جو اس کے بابا جان نے اس کی پیدائش کے صرف چند گھنٹے بعد لکھی تھی۔ اس نے ایک بار پھر صفحے پلٹے۔

۵ ستمبر ۱۹۸۱ء

میں اتنا مطمئن تھا مومنہ کے ساتھ کہ مجھے کوئی کمی کبھی محسوس ہی نہ ہوتی تھی اور اب ایک ننھی سی پری نے آ کے یہ احساس دلایا ہے کہ زندگی تو ابھی ادھوری تھی۔ ابھی اک رنگ باقی تھا..... اور میں نہیں جانتا تھا کہ یہ رنگ اتنا شوخ ہوگا۔ زندگی سے اتنا بھرپور..... جب اس نے پہلی بار اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما کے مجھے دیکھا..... پہلی بار میرے ہاتھوں نے اس کا مخمل سا ننھا چہرہ چھوا، پہلی بار جب وہ منے منے گلابی ہونٹ بسور کر روئی۔ اور پہلی بار جب میں نے اسے سینے سے لگایا۔ میری گود میں آتے ہی وہ چپ کر گئی، جیسے روئی ہی صرف میری گود میں آنے کے لیے تھی۔

Urdu.com
Urdu Photo

"دیکھو مومنہ، دیکھو اس کا چہرہ..... بالکل تمہارے جیسے ہونٹ، وہی ناک، وہی رخسار، وہی پیشانی، وہی آنکھیں۔"

"نہیں، اس کی آنکھوں کا رنگ میرا نہیں ہے۔"

اس کے کہنے پہ میں نے ذرا سا گدگدا کے اسے دوبارہ آنکھیں کھولنے پہ مجبور کیا۔

"ارے ہاں واقعی۔" اس کی نیلی کانچ سی آنکھیں دیکھ کے میں نے کہا۔ وہ شاید اس طرح کسمسائے جانے پہ بُرا مان گئی تھی۔ پھر سے مٹھیاں بھینچ کے رونے لگی۔

"دیکھو، مومنہ! تمہاری طرح اس کے بھی رونے پر آنسو نہیں نکلتے، صرف آنکھوں کا رنگ یہ بتاتا ہے کہ وہ رو رہی ہے۔ تم بھی جب روتی ہو تو شہد کے قطروں کے گرد جیسے کوئی رُوح افزا گرا جاتا ہے۔" میری مثال پہ وہ کھلکھلا کے ہنسی۔

"اور یہ جب روتی ہے تو نیلم کے ٹکڑوں کے گرد کوئی ہیرے کوٹ کے پھینک دیتا ہے۔" اس کی نیلی آنکھیں دیکھ کے میں نے کہا تھا۔

مقدس نے اپنی پلکوں کو انگلی کی پور سے چھوا، وہ نم تھیں۔

"بابا جان دیکھیے آج بھی میرے آنسو آنکھوں میں ہی تڑپتے پھرتے ہیں۔"

☆☆☆

وہ دیوار سے سر ٹیکے اکڑوں بیٹھا تھا جب ہڑبڑا کے اٹھا۔ اس نے چونک کے چاروں طرف دیکھا اور پھر سے رات کے سناٹے میں اس آواز کو کھوجنے کی کوشش کی مگر بے سود..... وہ بے چین ہو کے ٹہلنے لگا۔

"کیا میں نے خواب دیکھا تھا؟ لیکن خواب دیکھنے کے لیے سونا بھی تو پڑتا ہے میں کب سویا ہوں جو خواب دیکھا ہو..... پھر وہ آواز....."

یادوں کی جڑیں پھوٹ ہی پڑتی ہیں کہیں

سے

دل اگر سوکھ بھی جائے تو بنجر نہیں ہوتا

"یہ کس دراڑ سے اس کی یاد پھوٹ پڑی۔ میں نے تو دل کب کا پتھر کر لیا تھا۔" وہ سینے مسلنے لگا جہاں دو نیلی کانچ سی آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔

"اور جب یہ روتی ہے تو نیلم کے ٹکڑوں کے گرد کوئی ہیرے کوٹ کے پھینک دیتا ہے۔" کسی نے سرگوشی کی اور تاریکی میں دو روتی بسورتی آنکھیں ہزاروں شکوے لیے

اُبھر آئیں۔ نیلم کے شفاف ٹکڑے آنسوؤں سے نم ہو کے چمک رہے تھے۔ پلکوں پہ ٹھہرے آنسو ہیروں کی طرح جگر جگر کر رہے تھے۔ وہ مسکرا دیا۔ اچانک ان کے عقب سے دو اور آنکھوں نے جھانکا اور.....

"تمہاری آنکھوں کا رنگ بتاتا ہے کہ تم رو رہی تھیں۔" کسی نے ان بھوری آنکھوں میں پھیلے لال ڈورے دیکھ کے کہا۔ وہ ڈر گیا، خوفزدہ ہو گیا۔ دونوں ہاتھ چہرے پہ چھپا کے چلانے لگا۔

"اسی لیے..... اسی لیے مجھے بُری لگتی ہیں یہ یادیں وہ سب بھی یاد دلا دیتی ہیں، جنہیں بھلانے میں اتنے سال لگے ہیں۔"

ساتھ لاتی ہے ایک ایک منظر
یاد کچھ بھول کے نہیں آتی

☆☆☆

"کہاں جا رہے ہیں آپ اتنی صبح صبح" خان دراب خٹک کو صبح صبح جانے کی تیاریوں میں مصروف دیکھ کے ان کی بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

ظاہر ہے ان کا اتنا سویرے جاگنا اور پھر اتنے اہتمام کے ساتھ باہر نکلنا، خلافِ معمول جو تھا۔ وہ بدستور اپنے کام میں مشغول رہے تو زبیدہ خانم جھنجھلا گئیں۔ جیسے ہی وہ کن لوگ کے پلٹے تو بیگم کو راستے میں پھر موجود پایا۔

"اب کیا ہے؟" وہ اپنے مخصوص اکھڑ لہجے میں بولے۔

"شکار پہ آپ نہ تو اکیلے جاتے ہیں نہ ہی اتنی رازداری کے ساتھ پھر.....؟"

"بڑے لالہ کے پاس جا رہا ہوں، اسلام آباد۔ انہوں نے کسی کام سے بھیجنا ہے مجھے۔"

"انہیں آپ سے کیا کام ہو سکتا ہے، یا یوں کہیے کہ آپ ان کا کیا کام کر سکتے ہیں بھلا اور پھر نہ رائیور نہ گارڈ..... یوں فجر سے بھی پہلے روانگی کا کیا مطلب ہے۔" ان کی کسی طور تسلی نہ ہوتے دیکھ کے دراب زچ ہو گئے۔

"گارڈ کے ساتھ نکلا تو لوگ متوجہ ہو جائیں گے۔ اکیلے زیادہ رازداری کے ساتھ پہنچوں گا۔ بڑے لالہ کی خاص ہدایات ہیں کہ ملازمین تک کو علم نہ ہو، میرے گھر سے نکلنے کا۔ خود وہ بھی سارا دن آفس میں مصروف رہیں گے تاکہ سب کو یہ تاثر ملے کہ ہم دونوں بھائی سارا دن اپنے اپنے کام میں مصروف رہے ہیں اور زریاب لالہ کو....."

URDU PHOTO

"کہاں ہیں زریاب لالہ؟ کب آئے وہ؟" زبیدہ بے تابی سے اور آگے بڑھیں۔

"آہستہ زبیدہ آہستہ" وہ ڈپٹ کے بولے۔

"ابھی نہیں آئے وہ، کل آنا ہے انہیں۔ لیکن بڑے لالہ نے اپنے ذرائع استعمال کر کے انہیں آج ہی لانے کا انتظام کر لیا ہے۔ کل دشمن گھات لگائے بیٹھے ہوں گے۔ بلکہ وہ تو کئی روز سے چوکنے ہیں اس لیے آج بھی انہیں لانے کے لیے اتنی رازداری اور احتیاط برتی جا رہی ہے۔"

"ہائے اللہ۔" وہ سینے پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ گئیں۔

"اب کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں ایک بار لالہ خیریت کے ساتھ حویلی پہنچ جائیں۔ پھر کس کی جرأت ہے جو انہیں نقصان پہنچا سکے۔ آگے کے لیے بھی بڑے لالہ نے کافی کچھ سوچ رکھا ہے وہ انہیں دشمنوں کی پہنچ سے دُور بہت دور پہنچا دیں گے۔ یہاں تو وہ صرف انہیں باچا جان کی تسلی کے لیے لا رہے ہیں۔"

"اور آپ..... آپ اکیلے اتنے خطرناک کام....."

"کوئی خطرناک کام نہیں، یہ فرض ہے میرا۔ صرف احتیاط سے کام لے رہے ہیں ہم لوگ۔ ورنہ ایسی بات نہیں کہ خٹک خاندان اب [illegible] کے بیٹھ جائے۔ میرا بھائی آ رہا ہے اور میں اسے بحفاظت گھر لانے کے بجائے اپنے بچاؤ کے طریقے سوچنے بیٹھ جاؤں۔ تف ہے تم عورتوں کی بزدلی پر اور خبردار....." وہ پھر پلٹے۔ "خبردار ابھی گھر کے کسی فرد کو یہ علم نہیں ہونا چاہیے۔"

☆☆☆

"کیا کہا؟ پھر سے کہنا....." شناور چونک کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"میری مما! جیسا کہ تم لوگوں کی قیاس آرائیاں ہیں، انگلش یا جرمن نہیں، کالاش کی رہنے والی ہیں۔ وہ اس خاندان کا حصہ نہیں لیکن اسی وطن کے ایک خوب صورت پہاڑی خطے کی رہنے والی ہیں اور وہ مسلمان بھی ہیں، پیدائشی مسلمان..... مومنہ علی..... مومنہ زریاب خٹک۔"

اس نے دوبارہ زیادہ تفصیل سے بتایا۔ شناور کھوئی کھوئی کیفیت میں بیٹھی رہی۔ مقدس کے لیے اس کا ردعمل حیرت انگیز تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو وہ اس سے پوچھ رہی

تھی کہ ڈائری سے اس کی معلومات میں کیا اضافہ ہوا تب وہ ہنس ہنس کے بتانے لگی۔

"بے حد اضافہ ہوا میری معلومات میں دیر اور چترال میں مچھلی کا شکار کرنا اور جھیلوں میں نہانا منع ہے۔ سوات کا رقبہ ۸۷۸۸ مربع کلومیٹر ہے اور آبادی بارہ لاکھ ہے۔ چترال سے ایوان کے رستے کالام میں داخل ہوا جاتا ہے، وادی بمبوریت پر داخلہ ٹیکس پندرہ روپے ہے اور....."

"ہیں..... ہیں..... یہ کیا اول فول بک رہی ہو۔" وہ مشتبہ نظروں سے اسے گھورنے لگی۔

"اور سنو ناں..... وہاں کی اپنی زبان میں بمبوریت کو مرمریت، برو اور بری لا کہتے ہیں اور وہ جوان کا روایتی لباس ہوتا ہے ناں عورتوں کا کرتے کو "پوش" کمر کی پیٹی کو "مشوشت" اور ٹوپی کو "کوپسی" کہتے ہیں اور....."

"اسٹاپ اٹ مقدس تم نہیں بتانا چاہتیں تو نہ بتاؤ۔ لیکن یہ کافرستان کا سفرنامہ تو مت سناؤ۔" وہ باقاعدہ ناراض ہو گئی۔

"جو پڑھا ہے وہی سنا رہی ہوں، ڈیئر، میری مما بابا جان کو انہی پہاڑوں میں ملی تھیں۔" مقدس نے مختصراً تمام کہانی اسے سنا ڈالی۔

"مومنہ علی..... مومنہ زریاب..... مومنہ....." شناور بے یقینی سے بڑبڑا رہی تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے پھر سر جھٹک کے کہنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ مقدس حیرت سے اس کا اضطراب نوٹ کر رہی تھی۔ شناور کے چہرے پہ فیصلہ کن تاثرات پیدا ہوئے اور وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

"سنو مقدس! میں پورے وثوق سے تو نہیں کہہ سکتی لیکن میرا خیال ہے کہ میں تمہاری مما کو جانتی ہوں۔"

"کیا.....؟" وہ فرطِ حیرت سے اچھلنے کو تھی کہ شناور نے اس کے ہاتھ تھام کے پھر سے بٹھایا۔

"آرام سے بیٹھ کے سنو۔ میں نے ایک بار تمہیں بتایا تھا ناں کہ ہمارے ہاسپٹل میں ایک ملازمہ..... میرا مطلب ہے ایک عورت ہے جس کی شکل وصورت تم سے حد درجہ مشابہ ہے۔ تمہاری آنکھوں کی ساخت، چہرے کی بناوٹ، بالوں کی رنگت، ایک ایک نقش حتیٰ کہ آواز اور مسکراہٹ بھی بالکل ایک جیسی ہے۔ میری اس بات کو اس وقت تم نے مذاق

urdu-photo.com

میں اڑا دیا تھا خود میں بھی اسے زیادہ سیریس نہیں لے رہی تھی اس لیے بھول بھال گئی۔ اب تم نے جو بات بتائی ہے تو رہ رہ کے وہی چہرہ میری نگاہوں میں آ رہا ہے وہی شہد رنگت آنکھیں، سرو قد، وہی رخسار اور ٹھوڑی پہ گودے تل اور نام، اس کا نام بھی مومنہ ہی ہے۔ ہم سب انہیں اماں مومنہ کہتے ہیں۔"

"کیا واقعی؟ پھر تو وہ..... کیا پتہ وہی....." اس کے لبوں سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کے نکل رہے تھے۔

"ہاں شاید وہی..... اور شاید وہ نہ ہوں۔ تم ہر بات کے لیے خود کو تیار رکھو۔" شناور نے اس کے کپکپاتے وجود کو سہلایا۔

"میں اسی لیے یہ بات تمہیں بتانے میں ہچکچا رہی تھی۔ میں یہ تو نہیں جانتی کہ وہ کیلاش کی ہیں یا نہیں لیکن پٹھان ہیں یہ بات سب ہی جانتے ہیں۔ رواں اور شستہ اردو بولنے کے باوجود کہیں کہیں پشتو لب و لہجہ جھلک مار جاتا ہے اور پھر ان کی شکل و صورت، سب انہیں پٹھان ہی ظاہر کرتے ہیں۔ خصوصاً چہرے پہ گودے تل جو عموماً سرحد کی پہاڑی دوشیزاؤں کی نشانی ہیں۔ اسی لیے تمہارے ذکر کرتے ہی میرے تصور میں فوراً ان کا ہی چہرہ آیا۔ لیکن پتہ نہیں میں نے تمہیں بتا کے صحیح کیا یا غلط۔ میرا مطلب ہے ابھی یہ بات کنفرم تو نہیں ہے ناں یہ نام ایک ہی شخصیت کا تو نہیں ہو سکتا۔"

"نہیں شانو نہیں۔ تم ان کا ذکر کرتی ہو تو میرا دل تمہارے اک اک لفظ پہ ایمان لانے کو چاہتا ہے۔ یہ دل کہتا ہے شانو کہ وہی مما ہیں وہی میری مما ہیں۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

"مگر وہ نشان..... میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ ان کے چہرے پہ [illegible] ہیں۔ ایک طرف کا رخسار اور آنکھ کا نچلا حصہ پورا جلا ہوا ہے۔"

"جو بھی ہو..... میں جلد از جلد ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ تم ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ لاہور چلنے کی تیاری کرو۔"

"ابھی..... اسی وقت..... مگر کیسے؟" شناور بولی۔

"ابھی کل ہی دراب ماموں نے پوچھا تھا کہ وہ کب ہماری واپسی کی ٹکٹیں بنوائیں۔ تو میں نے انہیں اگلے ہفتے کسی بھی دن کی ٹکٹیں بک کروانے کے لیے کہا تھا۔ ابھی تقریباً بارہ چھٹیاں باقی ہیں۔"

"لیکن میں ایک ہفتہ نہیں رک سکتی۔ مجھے آج نہیں تو کل ضرور لاہور جانا ہے۔"

"اتنی جلدی ٹکٹیں کیسے ملیں گی محترمہ"

"بائی روڈ چلے جائیں گے۔" وہ مصر تھی۔

"بائی روڈ؟ پورے آٹھ گھنٹے کا سفر۔ نا بابا نا۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"پلیز شانو..... پلیز..... تم میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتیں۔" وہ منتوں پر اتر آئی۔

"میں تمہارے لیے بہت کچھ کر سکتی ہوں، مقدس لیکن تم خود سوچو محض میرے ہامی بھر لینے سے تم لاہور تو نہیں پہنچ جاؤ گی۔ بی بی جان کبھی ہمیں بائی روڈ اکیلے جانے کی اجازت نہیں دیں گی اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہم اپنے ہنگامی فیصلے کا ریزن کیا دیں گے۔"

"یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔ کم از کم تم ایک کوشش تو کر سکتی ہو۔ ویسے بھی بی بی جان تمہاری ہر بات مان لیتی ہیں۔ تم ان سے بات کر کے تو دیکھو۔ کوئی بھی بہانہ بنا لو پلیز۔"

"اچھا بابا!" اس کے مسلسل اصرار پہ وہ ہار مان کے بی بی جان کے پاس چلی آئی۔

"بی بی جان اور کیا وجہ ہونی ہے دراصل میں نے اور میری دوسری فرینڈز نے جس ایگزیبیشن میرا مطلب ہے تصویری مقابلے میں حصہ لینا تھا اس کی ڈیٹ یعنی تاریخ مقرر ہو گئی ہے اور ابھی ابھی شائستہ کا فون آیا تھا مجھے جلد از جلد وہاں پہنچنا ہے تاکہ اپنا نام لکھوا سکوں ورنہ پھر میں اس مقابلے میں شامل ہونے سے رہ جاؤں گی۔ آپ پلیز ہمیں ڈرائیور کے ساتھ بھجوا دیجیے۔ میرا مطلب ہے مقدس بھی میرے ساتھ ہی چلی جائے اس کی بھی چھٹیاں [illegible] لیکن مجھ سے اکیلے سفر نہیں کٹے گا۔"

وہ جانتی تھی اس کا بہانہ ایک دم بوگس اور فضول ہے، پھر بھی وہ بڑے دھڑلے سے بول [illegible] مقابل بی بی جان تھیں جنہیں اس کے کالج کا پتا معلوم تھا نہ تعلیم کی خبر۔ انہیں کیا علم کہ ایسے مقابلے یوں ہی منعقد نہیں ہوتے اور نہ ہی اسکول میں ہونے والے ٹیبلو پروگراموں کی طرح ان میں لائن میں لگ کے نام لکھوانا پڑتا ہے۔ پھر بھی وہ پُر یقین نہیں تھی کہ بی بی جان بھلے اس کی بات کا اعتبار کر لیں لیکن ضروری نہیں کہ اکیلے جانے کی اجازت بھی دے دیں۔ اور اس وقت وہ حیران رہ گئی جب بی بی جان نے بغیر کسی سوال کے کہہ دیا۔

"تم تیاری کرو۔ اگر ہو سکے تو نو بجے تک ڈرائیور کے ساتھ نکل جاؤ شام تک پہنچ جاؤ گی ورنہ تیاری میں دیر ہونے کی صورت میں کل صبح سفر کرنا۔ میں نہیں چاہتی تم دوپہر کو نکلو اور

urdu.com
URDU PHOTO

رات گئے ہاسٹل پہنچو۔"

"تھینک یو بی بی جان! ابھی نو بجنے میں پورا سوا گھنٹہ ہے۔ ہم تقریباً تیار ہی ہیں۔ آپ ڈرائیور کو کہلوا دیجیے۔" وہ بھاگتی ہوئی مقدس کو خبر سنانے کمرے سے نکلی اور بی بی جان نے سینے میں کب سے رکا سانس خارج کیا۔

"اچھا ہوا مقدس کے یہاں سے جانے کا سبب بن گیا۔ ورنہ زریاب کے یہاں آتے ہی پھر سے..... اچھا ہی ہوا جو آتے ہی اسے یہ صورت دیکھنے کو نہ ملے گی ورنہ....."

☆☆☆

"لالہ....." دراب نے بے تابی سے آگے بڑھ کے اسے گلے سے لگا لیا۔

"دراب تم؟" وہ حیران تھا۔ اس قید تنہائی میں کسی اپنے کی موجودگی؟ اذیت و کرب کے تھپیڑ سہتے وجود کو کسی کی مہربان بانہوں کا سہارا۔ اس نے حیرت سے خود کو اس کی بانہوں کی گرم جوش پناہ میں محسوس کیا۔

"تم یہاں کیسے؟"

"آپ کو لینے آیا ہوں لالہ....."

"مجھے لینے؟ کیا اتنا وقت بیت گیا۔" وہ حیران تھا کہاں تو سر پٹخ پٹخ کے بھی ایک رات نہ گزرتی تھی۔ کانٹوں پہ چل چل کے ایک ایک پہر بتایا تھا اور اب یہ کہہ رہا ہے..... کہ بیس سال گزر گئے۔

"چلیں..... لالہ، گھر چلیں۔" اس نے بھائی کا ہاتھ تھام کے آگے بڑھنا چاہا۔

"گھر؟ چلو۔" وہ یوں بولا جیسے اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ ہو۔

وہ بن ہو کے صحرا، دیوانے کو کیا مطلب
زنجیر کھلی ہو تو پھر خاک اُڑانا ہے

اور خان زریاب خٹک برسوں بعد گندی بوسیدہ دیواروں، پیر زخمی کرتی بیڑیوں اور سنگلاخ پتھروں والی زمین کی سنگت چھوڑ کے آزاد فضا میں آ گیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔

"سینٹرل جیل پشاور۔" کی تمام تر اذیتیں، تنہائیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔ سامنے کی آزاد دنیا میں اس کے لیے اور بھی کچھ تھی..... کچھ اور امتحان..... کچھ اور اذیتیں.....

☆☆☆

عمراں لنگیاں پباں پار
ہالے نہ وس او کالیا
عمراں لنگیاں پباں پار

"یہاں بھی ڈھنگ کا کوئی گانا نہیں لگ رہا۔"

وہ پوری طرح سے اسد امانت علی خان کی پُرسوز آواز میں کھوئی ہوئی تھی جب شناور نے ایف ایم ون ہنڈرڈ بھی آف کر دیا۔

"کسی ایک جگہ تو ٹک جاؤ۔" مقدس کو اس طرح اس کی مداخلت پہ اچھی خاصی کوفت ہوئی۔

"میرا بالکل دل نہیں لگ رہا ان اُجاڑ سنسان سڑکوں پہ تم بھی منہ لپیٹے بیٹھی ہو۔ پیکنگ بھی اس قدر افراتفری میں کی کہ کیسٹس بھی لانا بھول گئی۔ اُف کس طرح کٹے گا..... یہ سفر، ابھی پورے ساڑھے چار گھنٹے باقی ہیں۔" اس نے باقاعدہ واویلا مچا دیا۔

"تو کوئی رسالہ ہی پڑھ مرلو۔" اس نے سائیڈ پہ رکھے بیگ میں سے اکٹھے دو تین ڈائجسٹ نکال کے اس پہ پھینکے۔

"یا پھر کچھ دیر سونے کی کوشش کرو میرا دماغ مت چاٹو۔" وہ اس وقت واقعی بے حد اُلجھی ہوئی تھی، اسی لیے اس لہجے میں اس سے بات کر گئی، ورنہ شناور کی طبیعت کا بے صبرا پن اس کے لیے نئی چیز نہیں تھی۔ وہ بھی مقدس کی ذہنی کیفیت بھانپ کر چپ کر گئی لیکن نچلا بیٹھنا اس کی فطرت میں بھی کہاں تھا۔ چند منٹ منہ پھلا کے بیٹھنے کے بعد وہ ڈرائیور سے اُلجھی۔

"یہ کیا ہے ماما! اس قدر بکواس کیسٹ رکھے ہوئے ہیں تم نے، نام بھی اتنے ہولناک ہیں۔ "پختو پہ زہ کسٹم۔" اور یہ کیا ہے "شرنک دا بنگرو۔" مائی گاڈ کیا تصویر بنی ہے اس کے کور پہ نام ہے۔ "خونزے۔"

"وہ دو مجھے۔ سرہ لوپٹہ۔"

"واللہ کیا ظالم ظالم گانا ہے اس میں۔" اس نے سر دُھنتے ہوئے کیسٹ طلب کیا۔

"رہنے دو ماما! ہمیں نہیں یہ ظلم سہنا۔ اگر پشتو گانا سننا ہی ہیں تو بندہ رحیم شاہ یا پھر سردار ٹکر کو سنے کیوں مقدس۔؟" اسے آنکھیں موندے دیکھ کر وہ مایوس سی ہوئی۔ "اب کس سے سر پھوڑوں۔" ایک آدھ سیکنڈ ہی خاموش بیٹھے رہنے کے بعد وہ پھر آگے کی

Urdu.com
Urdu Photo

طرف جھکی۔

''اس سے تو اچھا ہے ایف ایم ون ہنڈرڈ ہی لگالوں۔ غزلیں اور کافیاں ہی سہی۔''

گاڑی میں پھر سے وہی پُر درد لے مدھم مدھم سی اُبھرنے لگی۔

کدے نہ سکھ سنیہا کہلیا

کدے نہ

ہائے کدے نہ

''خانہ خراب'' ایک جھٹکے سے گاڑی کے رُکنے پہ اورنگزیب ماما جھنجھلایا ہوا سا باہر نکلا۔

''کیا ہوا؟'' وہ دونوں بھی متفکر ہوگئیں۔

''ٹائر پنکچر ہوگیا ہے بی بی!'' وہ چیک کرنے کے بعد پیچھے کی طرف مڑا۔

''چلو، کوئی بات نہیں۔ زیادہ سے زیادہ دس بارہ منٹ لیں گے ٹائر چینج ہونے میں۔'' ان دونوں نے ایک دوسرے کو تسلی دی۔

''اوئے خانہ خراب کا بچہ۔ کسی چڑی کی اولاد پھر دغا دے گیا۔''

''اب کیا ہوا؟'' وہ دونوں بیک وقت شیشے نیچے کرکے باہر سر نکالتے ہوئے چلائیں۔

''وہ خبیث رمضانی نہیں ہے، اس کو میں بولا بھی تھا گاڑی چیک کرنے کے واسطے، یہ چیک کیا ہے اس خانہ خراب نے؟ پھالتو (فالتو) ٹائر مائر بھی نہیں رکھی۔''

''تمہاری تو پرانی عادت ہے ماما۔ اپنی غلطی دوسروں کے سر تھوپنے کی، کار تمہیں ڈرائیو کرنی تھی، تمہیں خود سب انتظام کرنا چاہیے تھا۔ وہ چڑی ہے تو تمہارا [illegible] ہوا ہے؟'' شناور کے ڈپٹنے پہ وہ چپ چاپ سر جھکائے کھڑا رہا۔

''ظالم ظالم گانوں والے یہ الم غلم کیسٹ بھرنے یاد تھے، ایک اسپیئر ٹائر نہیں رکھ سکتے تھے۔''

''اب بس بھی کرو۔ یوں سرِ راہ چلانے سے کچھ ہوجائے گا کیا؟''

مقدس نے ناگواری سے اسے دیکھا جو کمر پہ لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ جما کے بازو نچاتے ہوئے اورنگزیب کی خبر لے رہی تھی۔ آس پاس سے گزرتی گاڑیاں کچھ دیر کے لیے آہستہ ہوجاتی تھیں ان کے قریب سے گزرتے ہوئے۔ مقدس کو بھی فکر تو ضرور تھی

لیکن اس طرح سڑک پہ تماشا بن جانے کا خوف زیادہ تھا۔ وہ پھر سے آوازیں دے کے اسے گاڑی میں بیٹھنے کے لیے بلانے لگی۔ ایک سلور گرے کرولا کی اسپیڈ بھی سلو ہوگئی ان کے پاس آتے ہی، مگر دوسرے لوگوں کی طرح گردن باہر نکال کے محض صورتِ حال کا جائزہ لے کر گاڑی آگے بڑھا لے جانے کے بجائے اس شخص نے ان سے ذرا آگے سائیڈ پہ کار پارک کی اور خود ان کی طرف بڑھ آیا۔

''اینی پرابلم؟'' بے حد شائستہ انداز میں اس نے شناور سے پوچھا۔ جو غصے سے تمتمایا چہرہ لیے مسلسل ڈرائیور کو گھور رہی تھی۔ غصے کی زیادتی نے اسے ڈھنگ سے اس اجنبی کی بات کا جواب بھی نہیں دینے دیا۔ وہ محض بڑبڑا کے رہ گئی۔

''وہ ٹائر پنکچر ہوگیا ہے صیب اور پھالتو ٹائر بھی نہیں۔'' اورنگزیب منمنایا۔

''اوہ آپ پریشان مت ہوں مس۔ اپنی سیٹ پہ آرام سے بیٹھے جا کر، میں ٹائر دے دیتا ہوں آپ کے ڈرائیور کو۔'' وہ گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ پیچھے پیچھے باچھیں پھیلاتا ہوا اورنگزیب بھی لپکا۔

''ماما ایک منٹ'' مقدس نے پرس میں سے کچھ روپے نکالے۔ ''شناور یہ ماما کو پکڑا دو۔ ٹائر کی قیمت ادا کرکے پھر لیں۔''

''ایکسکیوزمی مس! یہ آپ نے بھجوائے ہیں؟'' وہ نوٹ لہراتا پھر شناور کے سر پہ موجود تھا۔ ''میں ٹائروں کی خرید و فروخت کا کام بالکل بھی نہیں کرتا۔ بائی پروفیشن، میں ایک [illegible] ہوں۔ اگر آپ کو ٹائر خریدنا ہی ہے تو میں آپ کے ڈرائیور کو چند میل آگے سروس اسٹیشن پہ ڈراپ کردیتا ہوں۔ لیکن..... یہ سوچیے کہ آپ کا یوں تنہا اس کے انتظار میں [illegible] ہونا مناسب ہوگا؟ یہی بہتر ہے کہ آپ یہ ٹائر لے لیں پلیز۔''

''دیکھیے ہم لوگ اس وقت آپ کی مدد لینے پہ مجبور ہیں، لیکن پھر بھی..... بغیر قیمت ادا کیے یہ ٹائر لینا بھی ہمیں گوارا نہیں۔'' مقدس باہر نکل آئی۔ اسے دیکھ کے وہ یوں چونکا جیسے گاڑی میں اس کی موجودگی سے بے خبر ہو۔

''اس طرح آپ کا یہ عمل مدد نہیں احسان کہلائے گا اور کسی کا احسان لینا ہماری روایات کا حصہ نہیں۔''

اس کے مضبوط لہجے اور پُر اعتماد انداز سے محظوظ ہوکے وہ مسکرایا۔

''اور خواتین کی مدد کرنے کا معاوضہ وصول کرنا ہماری روایات کا حصہ نہیں۔ بہرحال

hurdu.com
URDU PHOTO

آپ کے اُصول بھی مقدم ہیں ہمیں۔ آپ یوں کیجئے یہ میرا کارڈ رکھ لیں اور جب آپ کا مسئلہ حل ہو جائے میرا ٹائر مجھے واپس لوٹا دیجئے گا۔ شکریے کے ساتھ۔" وہ اس کی نیلی آنکھوں کی الجھن محسوس کر کے مسکرایا۔

"نہیں خیر، شکریہ تو ہمیں ابھی بھی آپ کا ادا کرنا چاہیے۔" شناور کو آداب یاد آ گئے۔

"اوئے خانہ خراب۔" اورنگزیب نے پھر دہائی دی۔ "یہ تو دو ٹائر پنکچر پڑے ہیں۔"

"اوہ نو!" ان تینوں کے منہ سے افسوس بھرے انداز میں ادا ہوا۔ مقدس تو مایوس سی ہو کر دوبارہ سے گاڑی میں بیٹھ گئی، جب کہ شناور ذرا آگے ہو کے گزرتی گاڑیوں کو اُمید بھرے انداز میں دیکھنے لگی کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ مزید ایک ٹائر دینے کے لیے رک جائے۔

"بی بی۔" اورنگزیب تیزی سے اس کی طرف آیا۔

"مجھے تو تم اپنی شکل ہی نہ دکھاؤ ماما۔" اس کے دھاڑنے پہ وہ سہم کر مقدس کی طرف بڑھا۔

"بی بی تم ہی سُن لو امارا بات۔"

"ہاں بولو۔" موڈ تو اس کا بھی خاصا خراب تھا لیکن سننے لگی کہ اب کیا مژدہ سناتا ہے، ماما اورنگزیب خان۔ شناور بھی سُن گن لینے پاس کھڑی ہو گئی۔

"وہ ڈاکٹر صیب (ڈاکٹر صاحب) کہتا ہے کہ ام تینوں اس کی گاڑی میں بیٹھیں اور وہ آگے کوئی ہوٹل موٹل ہے وہاں تک چھوڑ دیے گا۔ بی بی لوگ آرام سے بیٹھ کے اور (ادھر) چائے مائے پیے گا اور ام ٹائر لے کے واپس یہاں آئے گا ہمارا لڑکے کو ساتھ لے کر اور لینے آئے گا۔" اس نے پانچ نکاتی منصوبہ تفصیل سے دہرایا۔

"چلو یہ مسئلہ تو حل ہوا۔" شناور نے سکون بھری سانس لی۔

"لیکن ہم کیسے کسی اجنبی کے ساتھ چل پڑیں۔" مقدس کو اعتراض تھا۔

"بی بی کوئی پندرہ منٹ لگیں گے، بس ہوٹل تک جانے میں اور پھر ام ہے ناں تمہارے ساتھ۔" اس نے تسلی دی۔

"میرا خیال ہے مقدس یہی بہتر ہے۔ یہاں اکیلے موڑ دے پہ کھڑا ہونا بھی تو ناممکن سی بات ہے۔" اس کے کہنے پہ وہ مزید پس و پیش کرنے کے بجائے اپنا شولڈر بیگ

اٹھائے چادر درست کرتی باہر نکل آئی۔

"بی بی تم لوگ پھکر (فکر) مت کرو۔ ڈاکٹر صیب شریف آدمی ہے اور پختو (پشتو) بھی بولتا ہے۔"

وہ پختو بولتا ہے یا نہیں یہ تو پتا نہیں چل سکا۔ اتنا اندازہ ضرور ہو گیا ان دونوں کو کہ ڈاکٹر صیب واقعی شریف بندہ ہے۔ بارہ منٹ کی ڈرائیو میں اس نے بالکل بھی دونوں لڑکیوں کو مخاطب نہ کیا، البتہ کافی شاپ میں اس کی دی گئی کافی اور اسنیکس کی پیش کش شکریے کے ساتھ واپس لوٹا دینے پہ وہ چپ نہ رہ سکا۔

"یہ تو آپ میری مہمان نوازی کو ٹھیس پہنچا رہی ہیں محترمہ!"

"لیجئے خوامخواہ ہی۔ ہم بھلا آپ کے مہمان کیسے ہو گئے۔" شناور بحث پہ اُتر آئی۔ "کوئی آپ کے گھر تھوڑا ہی بیٹھے ہیں۔"

"ضروری نہیں کہ گھر آنے والا ہی مہمان ہو۔ آپ میری گاڑی میں بیٹھ کر یہاں تک آئی ہیں۔ میری نظر میں اس وقت آپ میری معزز مہمان ہیں اور آپ کی تواضع کرنا میرا فرض ہے" اس کے پاس بھی جواب حاضر تھا۔

"معاف کیجئے گا، آپ کی مدد اور تعاون کے لیے ہم واقعی شکر گزار ہیں، لیکن یہ ہماری مجبوری تھی ورنہ جس خاندان سے ہمارا تعلق ہے وہاں لڑکیاں اجنبیوں سے تواضع نہیں کرواتی پھرتیں۔" اب کی بار مقدس اپنے مخصوص سنجیدہ اور دوٹوک انداز میں بولی تو وہ [illegible] مسکرایا جیسے اب تک کی بلا مقصد بحث محض اسے بولنے پر اُکسانے کی ایک کوشش ہو۔

"[illegible] بجا فرمایا آپ نے۔ اجنبیوں سے گریز اچھی بچیوں کا شیوہ ہے لیکن....." وہ لطف لینے کو مقدس کی برہمی کا۔ "اگر وہ واقعی اجنبی ہو تو....."

مقدس سراپا جل گئی اس کے فقرے پہ، اس نے پہلی بار نظر اُٹھا کے سامنے بیٹھے خوش قامت و خوش لباس شخص کو بغور دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں استفسار پڑھ کے وہ مسکرایا۔

"آپ کے بیگ میں میرا کارڈ موجود ہے۔ اس لحاظ سے تو آپ کو مجھے اجنبی نہیں کہنا چاہیے۔" مقدس کا دایاں ہاتھ بے ساختہ اپنے بیگ کی طرف سرک گیا۔ اسے یاد آیا بے دھیانی میں اس نے یہ کارڈ بغیر دیکھے ہی بیگ کے اندر ڈال لیا تھا۔ وہ بھی شاید اس کی بے اعتنائی جان چکا تھا اس لیے اپنا باقاعدہ تعارف کروانے لگا۔

urdu.com
URDU PHOTO

"مجھے ڈاکٹر خوشنود کہتے ہیں۔ ایوب میڈیکل کالج ایبٹ آباد میں اعزازی طور پر تعینات ہوں۔ اس کے علاوہ اسلام آباد میں اپنا ایک ذاتی کلینک بنانے کا ارادہ ہے۔ آج کل اسی کے سلسلے میں کچھ مصروفیات ہیں۔ لاہور میں ایک ذاتی نوعیت کے کام سے جا رہا ہوں۔ آپ لوگ بھی شاید لاہور ہی جا رہی ہیں۔" ان کا تعارف لینے کے بجائے اس نے سرسری سا ایک سوال کیا اور اثبات میں جواب ملنے پر خاموشی سے کافی پینے لگا۔ اگرچہ اس نے دوبارہ ان سے اصرار نہیں کیا تھا لیکن اس طرح اکڑ کر بیٹھے رہنا کم از کم شناور سے گوارا نہیں ہوا اور اس نے بھی اپنا مگ اٹھا لیا۔ مقدس نے ایک نظر سامنے بیٹھے اس نفیس طبع شخص کو دیکھا جو اس وقت گردوپیش سے لاپروا نظر آتا ہوا کافی اور اخبار سے شغل فرما رہا تھا اور جس نے تکلفاً بھی ایک بار اپنے سامنے بیٹھی لڑکیوں کا نام پتہ نہیں جاننا چاہا تھا۔ اس کے ہاتھ خود بخود اپنے سامنے رکھے بھاپ اڑاتے مگ کی طرف اٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر میں اورنگزیب سامنے سے آتا نظر آیا۔

"گاڑی آ گیا ہے بی بی! وہ جن بس والوں نے ام کو لفٹ دیا تھا انہوں نے ٹائر بدلنے میں بھی مدد کر دیا اسی لیے ام جلدی واپس آ گیا۔"

"شکر ہے اللہ کا۔" دونوں جلدی جلدی اپنے بیگ اور پرس سنبھالنے لگیں۔

"آج زندگی میں پہلی بار میں نے اورنگزیب ماما کی صورت دیکھنے کے بعد شکر کا کلمہ پڑھا ہے۔" شناور اس کے کان میں گھس کر بولی تو باوجود اس قدر تناؤ کے بھی وہ مسکرا دی۔ خوشنود نے دلچسپی سے سرمئی گرم شال کے ہالے میں لپٹے اس صبیح چہرے پہ پھوٹتی مسکراہٹ کی کرن دیکھی۔

"چیئے اُس کے؟" (چائے پیو گے) اس کی آفر [illegible] چاہتا تھا، لیکن شناور کی گھوریوں سے گھبرا کے نفی میں سر ہلاتا ہوا بیگ اٹھانے لگا۔ خوشنود ایک طرف بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ گاڑی میں بیٹھ رہی تھیں اسے ہاتھ میں ڈسپوزایبل کپ پکڑے اس طرف آتے دیکھا۔ اس نے زبردستی اورنگزیب کو چائے پکڑائی۔ شناور کے دوبارہ شکریہ ادا کرنے پہ بھی مقدس چاہنے کے باوجود اسے تھینک یو تک نہ کہہ سکی۔

☆☆☆

"کون؟ وہ پٹھانی؟" ان کے پوچھنے پہ ہاسٹل وارڈن نے سوال کیا۔

"جی میڈم وہی، کیا آپ بتا سکیں گی اس وقت وہ کہاں ملیں گی؟"

"تم لوگوں کو اس سے کیا کام ہے؟" انہوں نے الٹا تفتیش شروع کر دی۔

"کتنی بار تم لڑکیوں کو تاکید کی ہے کہ اسٹاف کے ساتھ اس قسم کی عنایتیں وغیرہ مت کیا کرو۔ یقیناً تم نے اسے کچھ رقم اُدھار دی ہو گی اور اب وہ تمہارے ہاتھ نہیں لگ رہی۔"

"نو میڈم ایسی بات نہیں۔ ان سے کچھ اور کام تھا مجھے۔" شناور ان کی مسلسل جحت پہ زچ ہو گئی۔

"آپ پلیز انہیں بلوا دیں یا مجھے بتا دیں وہ اس وقت کہاں ہوں گی۔"

"وہ تو پچھلے ایک ہفتے سے غیر حاضر ہے۔ پرسوں اطلاع ملی تھی کہ کچھ بیمار وغیرہ ہے، شاید کسی ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے۔ مجھے کچھ صحیح علم نہیں ہے۔" وہ گول مول جواب دے کے ٹیلی فون پہ کوئی نمبر پش کرنے لگیں۔

"کون سے ہاسپٹل میں؟ کیا ہوا ہے انہیں؟" مقدس جواب تک خاموشی سے کھڑی دونوں کے چہرے باری باری تک رہی تھی، بے صبری سے کہہ اٹھی۔ وارڈن نے ناگواری سے اسے دیکھا اور ماؤتھ پیس پہ ہاتھ رکھ کے بولیں۔

"میں نے کہا ناں، مجھے علم نہیں۔ تمام ملازمین کی مزاج پرسی اور عیادت میری ڈیوٹی میں شامل نہیں ہے۔..... ہاں عرفانہ..... کیسی ہیں آپ، ایک کام کہا تھا آپ سے....." وہ رخ موڑ کے مکمل طور پر فون پہ متوجہ ہو گئیں جو اس بات کا اشارہ تھا کہ اب وہ کسی اور سوال کا جواب دینے کے موڈ میں نہیں۔ شناور نے شانے اُچکا کے خود پہ ضبط کرتی مقدس کو دیکھا اور اس کا ہاتھ تھام کے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

"ایک منٹ ٹھہرو۔" وارڈن کی آواز پہ وہ چونک کر مڑیں۔ "اماں برکتے..... یہاں آنا..... ذرا ان لڑکیوں کے ساتھ باہر جا کر بات کر لو اور ہاں شناور یہ اماں اس پٹھانی کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ اس سے پوچھ لو جو بھی پوچھنا ہے۔" بڑی عجلت میں انہوں نے ریسیور کان سے لگائے ہوئے، معاملہ بھگتایا۔

"کی گل اے کڑیے۔" اماں برکتے شناور کو جانتی تھیں اس لیے براہ راست اس سے سوال کیا۔ وہ تینوں اس وقت خنک اور قدرے تاریک کوریڈور سے گزر کر بیرونی دروازے کے ساتھ بنے احاطے میں کھڑی تھیں۔ چمک دار دھوپ نے ایک دم سے سامنے آ کر آنکھوں کو چندھیا دیا تھا۔

Urdu.com
Sabha
URDU PHOTO

"اماں وہ جو کچن میں ایک خوبصورت سی گوری چٹی اماں ہوتی ہیں، اماں مومنہ، وہ کہاں ملیں گی اس وقت؟"

"کیوں؟ تمہیں کیا کام ہے؟" اُف پھر وہی سوال۔

"کام ہے تو پوچھ رہے ہیں ناں"

"اوہ تاں بیمار اے..... (وہ تو بیمار ہے)

"کیا ہوا ہے انہیں؟" مقدس کو اس اَن دیکھی عورت کی بیماری بے چین کر رہی تھی۔

"ایہہ....." (یہ.....؟) اماں برکتے نے آنکھوں پہ ہاتھ کا چھجا بنا کر اسے بغور دیکھا۔ اس کی سخت مزاج آنکھوں میں تعجب کے رنگ واضح نظر آنے لگے۔ شاور نے اسے پھر اپنی جانب متوجہ کیا۔

"کیا کسی ہاسپٹل میں ہے؟"

"مینوں نئیں پتہ۔" وہ یکا یک واپس مڑنے لگی۔

"ایک منٹ اماں..... رکیں تو سہی....." وہ رک گئی لیکن شناور کے مقابل کھڑے ہونے کے باوجود اس کی آنکھیں بار بار مقدس کے پریشان اور الجھے ہوئے وجود پر بھٹک جاتی تھیں۔

"آپ دونوں ایک ہی کوارٹر میں رہتی ہیں۔ کئی سالوں سے ایک ساتھ ہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ ان کے بارے میں بالکل بھی کوئی خبر نہ رکھتی ہوں، کہ وہ کہاں ہیں، کس حال میں ہیں۔" شناور کے جرح کے انداز پہ اماں برکتے بگڑ گئیں۔

"اپنا کام کر کڑیے۔ تیرا کی مطلب پٹھانی سے وہ کدر ہے کدر نئیں تجھے کیا؟"

"اماں ناراض مت ہو۔ دراصل دو سال سے انہیں دیکھتی آ رہی ہوں۔ ہاسٹل میں رہنے والی لڑکیوں کے لیے تو آپ اور دیگر لوگ ہی گھر کے افراد جیسے ہوتے ہیں ناں۔" وہ چاپلوسی پہ اُتر آئی۔

"بس ان کی بیماری کا سنا تو پریشانی سی ہوئی۔ آپ سے اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ شاید انہیں کسی مدد کی ضرورت ہو۔ آخر انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ اگر آپ بتا دیں کہ وہ کس ہاسپٹل میں ہیں تو میں انہیں دیکھ بھی آؤں گی اور علاج معالجہ وغیرہ کے سلسلے میں کچھ مدد بھی کر دوں گی۔ بس اتنی سی بات ہے۔" اس کے چہرے پہ پھیلی کمال معصومیت اور لہجے کی انتہا درجے کی مٹھاس شاید اماں برکتے کو موم کر دیتی، لیکن سامنے کھڑی مقدس کا

متفکر چہرہ اور مضطرب انداز میں چٹختی انگلیاں باور کرا رہی تھیں کہ بات اتنی سی نہیں۔

"مینوں سچی نئیں پتا، اوہ کیسے نوں وسدی وی نئیں سی اپنی کوئی گل۔ پر میرا خیال اے اوہ ہن واپس آن نہیں جے لگی۔ ہورے اپنے پنڈ چلی گئی ہوئے۔" (مجھے واقعی نہیں پتا، وہ کسی کو بتاتی بھی نہیں تھی، اپنی کوئی بات۔ لیکن میرا خیال ہے وہ اب واپس نہیں آنے والی۔ شاید اپنے گاؤں چلی گئی ہو) وہ تیز تیز قدموں سے واپس اندر کی طرف چلی گئی۔

"کیا کہہ رہی تھیں؟" اسے ایک لفظ نہ پلے پڑا۔

"شاید وہ واقعی نہیں جانتیں۔"

"نہیں شانو، انہیں سب پتا ہے، صاف نظر آ رہا ہے کہ وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہیں۔" لوگ تو شانو کو بھی رہا تھا لیکن اس نے اس کی تائید کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

"اگر پتا ہوتا تو بھلا وہ ہم سے کیوں چھپاتیں۔" وہ ہر صورت اس کا دھیان بٹانا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی سوئی بار بار اماں برکتے کی کھوجتی نظروں پہ اٹکی ہوئی تھی۔

"پھر وہ مجھے یوں کیوں دیکھ رہی تھیں۔ مجھ پہ نظر پڑتے ہی ان کے چہرے کے تاثرات بدل سے گئے تھے، شانو تم کہہ رہی تھیں ناں کہ میرے اور ان کے چہرے میں بے حد مشابہت ہے تو کیا اس لیے؟"

"ہوسکتا ہے..... لیکن اس مشابہت کو بہت کم لوگ محسوس کر سکتے ہیں، خصوصاً وہ جو تمہیں یا ان خاتون کو بہت قریب سے جانتے ہوں۔ جب میں نے پہلی بار انہیں دیکھا تو اس چہرے کے نین نقش مجھے چونکا گئے تھے کیونکہ برسوں سے ان نقوش سے میری واقفیت رہی ہے۔ اسی طرح چونکہ اماں مومنہ کے ساتھ گزشتہ کئی سالوں سے رہتی چلی آ رہی ہیں اس لیے تمہاری صورت دیکھ کے انہیں اچنبھا تو ہوا ہی ہوگا۔ ورنہ سرسری سا دیکھنے پہ یہ مشابہت یوں محسوس نہیں ہوتی کہ ایک تو عمر کا فرق، دوسرے ان کے چہرے کا ایک تہائی حصہ خاصا جلا ہوا ہے۔"

"اور..... اور..... یہ چہرہ کس نے جلایا ہوگا؟" اس نے جیسے ہواؤں سے سرگوشی کی تھی۔

"پلیز مقدس..... ان سوالوں میں خود کو مت الجھاؤ۔ میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ ہم یہاں ایک امید لے کے آئے ہیں۔ الجھے ہوئے دھاگے کا ایک سرا ڈھونڈنے لیکن جب تک کوئی بات واضح نہ ہو جائے تم یہ فرض کر کے مت بیٹھ جاؤ کہ وہی تمہاری مما

UrduPhoto.com

ہیں'' اسے تابعداری سے سر ہلاتے دیکھ کے اسے ذرا تسلی ہوئی۔

''اور ہاں اکیلے مت جانا ہاسٹل، مجھے لائبریری میں بس دس منٹ کا کام ہے۔ میں فارغ ہو کے آتی ہوں تو اکٹھے ہی نکلتے ہیں۔ تمہیں وہاں چھوڑ کے میں زارا کی طرف جاؤں گی۔ اس کے ساتھ ایگزیبیشن کے کچھ معاملے نمٹانے ہیں۔''

اسے آڈیٹوریم کی سنسان سیڑھیوں پہ گم صم بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ خشک پتوں کے کراہنے کی آوازیں اس کے خالی دماغ میں گونجیں پھر ایک بھاری مردانہ آواز اسے غائب الدماغی کی کیفیت سے مکمل طور پر نکال لائی۔

''السلام علیکم'' اس نے گرد آلود سیڑھیوں پہ انگلی سے لائنیں کھینچنے کا شغل ترک کر کے سامنے نظر اٹھائی۔ چند لمحے اسے انجان نظروں سے دیکھنے کے بعد وہ جیسے ہوش میں آ گئی۔

''آپ.....؟.....یہاں''

''جی.....میں ڈاکٹر خوشنود.....اور یہاں۔'' اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی رمق پا کے وہ ریلیکس سا ہو کر وہیں ذرا فاصلے پہ بیٹھ گیا۔ ''بڑی کمزور یادداشت ہے آپ کی۔ محض چوبیس گھنٹے پہلے ہونے والی ملاقات بھی آپ کے ذہن سے محو ہو گئی۔''

''جی نہیں.....ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' وہ اجنبی سے کیا بتاتی کہ ذہن اس وقت کن طوفانوں کی زد میں ہے۔ وہ تو ابھی خود کو پہچاننے کے مراحل سے گزر رہا ہے، کسی دوسرے کا حوالہ کیا یاد رکھے۔ ''دراصل میں آپ کو یہاں دیکھ کے حیران ہوئی تھی۔ آپ تو ڈاکٹر ہیں ناں پھر یہاں۔''

''میں ایک ذاتی کام سے آیا تھا۔ آپ یہاں پڑھتی ہیں۔'' اس کے سوال کا جواب پیچھے سے آتی شناور نے دیا۔

''جی نہیں، یہ بھی یہاں ایک ذاتی کام سے آئی ہیں۔ نجانے اس ملک کے ڈاکٹروں کو ہم فنکاروں سے کیا کام پڑ گئے ہیں۔''

''السلام علیکم''

''شکر ہے سلام کا جواب تو ملا۔ ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ سلام کرنے کے ساتھ ساتھ آپ میں سلام کا جواب دینے کی بھی روایت نہیں۔'' مقدس اس کا طنز محسوس کیے بغیر چپ چاپ بیٹھی رہی۔

''تو آپ بھی ڈاکٹر ہیں، یقین نہیں آتا'' اس نے لائٹ براؤن کڑھائی والی آف وہائٹ چادر میں سلیقے سے لپٹی اس مختصر الوجود لڑکی کو بے یقینی سے دیکھا جو چہرے پہ چھائی سنجیدگی اور پُر وقار طریقے سے اوڑھے چادر کے باوجود بھی کم عمری ٹین ایجر ہی نظر آتی تھی۔

''تقریباً'' اس بار بھی اس کی طرف سے جواب شناور نے ہی دیا۔

''یہ زیر تعمیر ڈاکٹر ہیں۔ ایم بی بی ایس کے فائنل ایئر میں ہے، کنگ ایڈورڈ کالج میں۔'' اس نے مقدس کے گھورنے کی پروا نہ کرتے ہوئے تعارف کا سلسلہ مزید آگے بڑھایا، ''اور میں شناور گل، مقدس کی فرسٹ کزن اور اکلوتی فرینڈ، یہاں منی ایجیز ڈیپارٹمنٹ میں ہوں۔''

''بے حد خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' اس نے ہنستے ہوئے تعارف سے اگلی رسم بھی نبھا دی۔

''آپ لاہور میں کب تک ہیں؟''

''کچھ صحیح اندازہ نہیں کب تک رُکنا پڑے، لیکن اس ایک ہفتے تک تو واپسی کا کوئی ارادہ نہیں۔''

''تو پھر یہ میری طرف سے باقاعدہ انویٹیشن ہے آرٹ گیلری میں، ہمارے ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ایگزیبیشن ہے پرسوں۔ ضرور آیئے گا۔''

''جی ضرور'' اس نے فوراً ہامی بھر لی۔ بعد میں سارے راستے ہی مقدس اس سے بحث کرتی رہی۔

''کیا ضرورت تھی اتنے تفصیلی بیان کی فائنل ایئر کی اسٹوڈنٹ کنگ ایڈورڈ کالج۔ منی ایجیز ڈیپارٹمنٹ اور تو اور فضول میں انوائیٹ بھی کیا۔ پتہ نہیں کب عقل آئے گی ہر کسی سے بلاوجہ فرینک ہو جاتی ہو۔ نجانے کون ہے، کیسا ہے۔ کیا سمجھ رہا ہو گا ہمیں۔''

''اوہو تم کیوں اس قدر پکی ہو جاتی ہو اس معاملے میں۔ آخر کسی سے ذرا سا تعارف حاصل کرنے میں کوئی ذاتیات کی حدود میں داخل نہیں ہو جاتا۔ اس نے ہماری مدد کی تھی اس بات سے تو انکار نہیں ہے ناں تمہیں، پھر کیا ہوا اگر میں نے اخلاقاً اسے انوائیٹ کر لیا آخر پرسوں کی ایگزیبیشن میں شامل سارے لوگ ہمارے واقف کار ہی تو نہیں ہوں گے۔ اجنبیوں کا وہاں آنا منع تو نہیں ہے اور پھر..... دو ملاقاتوں کے بعد کوئی

1urdu.com
Urdu Photo

اجنبی نہیں رہتا۔" شناور کو اس کی انتہا درجے کی احتیاط پسندی سے چڑ تھی۔

"اور پھر وہ کون ہے، کیا ہے اس کا اندازہ تو تمہیں بھی ہو ہی گیا ہوگا۔ اس قدر پولائٹ، کلچرڈ اور ویل مینرڈ شخص کم از کم میں نے تو پہلی بار دیکھا ہے۔ خواتین کا احترام کرنا جانتا ہے۔ تم نے محسوس کیا اس نے ایک بار بھی ہمیں کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ نام نہیں پوچھا۔ پتہ نہیں جاننا چاہا اس سے ظاہر ہوتا کہ وہ....."

"پلیز شانو، پلیز اسٹاپ اٹ۔" اس نے تنگ آ کے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے۔ نجانے کیوں وہ اس شخص کی تعریف میں ایک لفظ مزید نہ سننا چاہتی تھی، لیکن بھلا کسی کے چاہنے سے بھی کچھ ہوا ہے۔ ایگزیبیشن والے روز شناور اسے کھینچ گھسیٹ کر کے اپنے ساتھ لے ہی گئی۔ اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود اس نے مقدس کو زبردستی تیار کیا تھا۔

"یہاں اکیلی بیٹھی کیا کرو گی۔ اب چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے آ ہی گئے ہیں، محض تمہاری ضد کے ہاتھوں مجبور ہو کے تو کسی نہ کسی طرح وقت گزارنا ہی ہے۔ وہ تو شکر ہے زارا اور احمد نے ایگزیبیشن کا پروگرام بنایا ہوا تھا ورنہ میں نے تو تمہاری جان نہیں چھوڑنی تھی اگر مجھے بوریت کا شکار ہونا پڑتا۔"

"کوئی احسان نہیں کیا تم نے میرے ساتھ [illegible] میں یہاں آئی تھی، وہ تو اب تک ادھورا ہے۔ تم سب کچھ بھلائے اپنے دوست کے کاموں میں مصروف ہو۔" اس نے شکوہ کیا۔

"میں بھولی نہیں جان، لیکن اس طرح بار بار وہاں جانے کا کیا فائدہ؟ خیر تمہاری تسلی کے لیے کل پھر چلیں گے پتا کرنے۔" اس نے کسی طرح بہلا پھسلا کے اسے جانے پہ تیار کر ہی لیا۔ وہ جانتی تھی کہ مقدس اس وقت کس ذہنی کیفیت سے دوچار ہے۔ ادھوری معلومات اسے کچلے دے رہی ہیں اور جب تک وہ کسی واضح نتیجے تک نہیں پہنچ جاتی یونہی امید و بیم کا شکار رہے گی۔ اب تو خود شناور بھی بے چینی سے اماں مومنہ کی منتظر تھی تاکہ آر یا پار کوئی تو حل نکلے۔ وہ مقدس کی مما ہیں یا نہیں، یہ معمہ تو کھلے۔

"السلام علیکم" اس بار شناور نے خوشنود کو دیکھ کر لپک کے سلام کرنے میں پہل کی۔

وعلیکم السلام۔" اس نے مسکراتے ہوئے شناور کے سلام کا جواب دینے کے بعد مقدس کی طرف دیکھا۔ "کیسی ہیں آپ؟"

"جی ٹھیک ہوں۔" اب اتنی بداخلاق تو وہ بھی نہ تھی کہ جواب ہی نہ دیتی۔ لیکن مزید

گفتگو سے بچنے کی خطر دانستہ رُخ موڑ کے پینٹنگز دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر خوشنود کو مکمل طور پر مقدس کی طرف متوجہ دیکھ کے شناور ٹھٹکی اور کچھ سوچ کے غیر محسوس انداز میں دونوں کے درمیان سے نکل گئی۔ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے بڑی دلچسپی سے اس کی بے اعتنائی کے مظاہرہ دیکھنے لگا۔ اس وقت آرٹ گیلری میں موجود ایک سے ایک ماڈرن ازم کی شکار لڑکیوں کے درمیان اس کا سادہ مگر پروقار وجود انفرادیت کے احساس سے دوچار کر رہا تھا۔ سر کو مکمل طور پر ہر وقت ڈھانپے رہنے والا آنچل، سر کو قدرے اُونچا کر کے پینٹنگز دیکھنے کی کوشش میں ذرا سا ڈھلک گیا تھا۔ سنہرے بالوں کے درمیان سے نکلتی سیدھی اور شفاف مانگ میں کہیں کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ پیشانی کا نور یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اس کے نام کے رکھنے میں اس کی شخصیت میں کتنے گہرے ہیں۔ مصنوعی رنگوں سے قطعی بے نیاز لب و رخسار نقرئی جلد پہ یاقوت کی مانند دمک رہے تھے۔

"اور آنکھوں میں ترسے ہوئے نیلم اس چہرے کو کس قدر بیش قیمت بنا رہے ہیں۔" خوشنود نے سوچا۔

"[illegible] کیا ہے..... کون سا تاثر ہے جو اس انمول نگینے کو محروم ظاہر کر رہا ہے..... اداسی [illegible] کا سبب کیا ہے جو اس بکھری ہوئی شخصیت کو دھندلائے دے رہی ہے..... وہ کون سی الجھن ہے جس کے الجھاؤ نے اسے گرد و پیش سے اس قدر بیگانہ کر دیا ہے۔" وہ اس کی کھوئی کھوئی سی کیفیت کا [illegible] سوچنے میں خود بھی کہیں کھو سا گیا۔

[illegible] کی خاموشی محسوس کر کے مقدس نے پلٹ کر دیکھنا چاہا۔ شناور غائب تھی لیکن ڈاکٹر خوشنود [illegible] اس کے عقب میں دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہا تھا۔ اس کے یک دم رُکنے پہ وہ بھی ٹھٹھک کر ٹھہر گیا۔ ان آنکھوں میں سراسیمگی سی محسوس کر کے وہ کہنے لگا۔

"آپ کی کزن غالباً اپنے کلاس فیلوز کے ہمراہ ہیں۔"

مقدس کو اس لڑکی پہ بے انتہا غصہ آیا جو ضد کر کے اسے ساتھ لائی تھی اور اب اجنبی لوگوں میں تنہا چھوڑ گئی تھی۔ تنہا ہونے کی بے بسی اس کے ہر نقش سے عیاں ہونے لگی، جسے محسوس کر کے وہ پھر کہہ اُٹھا۔

"آپ اپنی دوست پہ اتنا ڈپینڈ کیوں کرتی ہیں؟"

"ڈپینڈ؟ جی نہیں میں صرف اس کی عادی ہوں اور کوئی بات نہیں، ہمارا ساتھ کئی برسوں پرانا ہے اور پھر میری کسی سے کوئی خاص دوستی بھی نہیں، اس لیے اس کا میرے پاس

UrduPhoto.com
Sabah

نہ ہونا مجھے کچھ ڈسٹرب کر جاتا ہے۔" وہ اس کے سوال کا جواب دینے کی پابند تو نہ تھی لیکن اس کے ڈیپینڈ کرنے والے الزام نے اسے جز بز کر دیا تھا۔

"اور یہ ڈسٹربنس تو آپ پہ مکمل طور پر چھائی ہوئی ہے۔" وہ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی جھنجھلاہٹ دیکھ کے خاموش ہی رہا۔

☆☆☆

اسے خان افراسیاب خٹک کے گھر آئے دو روز گزر چکے تھے۔ اس کی حالت اتنی دگرگوں تھی کہ دراب کو اسے اس طرح باچا جان کے سامنے لے جاتے ہوئے خوف محسوس ہوا اسی لیے بڑے لالہ کی ہدایت کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے وہ سیدھا زریاب کو یہاں لے آیا تھا۔ خود افراسیاب، بھائی کا شکستہ وجود دیکھ کے ڈھے گئے۔ ان گزرے دو عشروں میں انہوں نے بھائی کی ایک جھلک تک دیکھنے سے اجتناب کیا تھا۔ شروع شروع میں جب بھی کوئی زریاب سے ملنے کی کوشش کرتا اس کی ہذیانی کیفیت بڑھ جاتی۔ وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا، کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ افراسیاب کی ہر اس کوشش کو بھی اس نے سختی سے رد کر دیا، جو انہوں نے اسے بچانے کے لیے کرنا چاہی، وہ اپنے اثر و رسوخ استعمال کر کے اس کی سزا کم سے کم کروانا چاہتے تھے۔ لیکن زریاب نے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا۔

"میں حرام موت نہیں مرنا چاہتا، لیکن لالہ مجھے اس کے لیے مجبور مت کرو۔ اس وقت جس چیز کی مجھے سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ موت ہے اور جس چیز سے میں ہر ممکن طرح بچنا چاہتا ہوں، وہ زندگی ہے۔ مجھے ان بوسیدہ دیواروں کے اندر گھٹنے سڑنے دو۔ یہاں قید میرے وجود کے زندہ ہونے کی خبر تو کسی کو نہ ہوگی۔ خدا کے لیے لالہ مجھے اشتہار مت بناؤ..... مجھے روشنی میں مت لاؤ..... اندھیرے میں پڑا رہنے دو اور دعا کرو کہ یہ دیواریں میرا بھرم رکھ لیں۔ مجھے زندگی کی طرف کھینچ کے لانے کی کوشش مت کرو..... میری موت کی دعا کرو۔ باعزت موت کی۔ ..... ورنہ..... اگر مجھے دوبارہ باہر لانے کی کوشش کی تو..... میں اپنے آپ کو ختم کر لوں گا۔ مجھے حرام موت کی طرف بڑھنے پہ مجبور مت کرو لالہ۔" اس کے جنون اور دیوانگی سے گھبرا کے خان افراسیاب نے اسے اس کے حال پہ چھوڑ دیا، لیکن وہ اس کی موت کی دعا نہ مانگ سکے۔ بس بے چینی سے وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگے.....

وقت جو تلخ سے تلخ زہر کو بھی بے اثر کر دیتا ہے۔ وقت جو بھیانک سے بھیانک ترعکس پہ بھی گرد کی تہ جما دیتا ہے۔

وقت جو گہرے سے گہرے گھاؤ کو بھی بھرتا نہیں تو کھرنڈ تو ضرور لے آتا ہے۔

اور شاید زریاب کے زخموں پہ بھی کھرنڈ آ چکے تھے۔ ان سے خون تو اب بھی رستا تھا لیکن اس طرح بہتا نہیں تھا۔ اس کی ویران آنکھوں میں دیوانگی اب بھی ٹکریں مارتی دکھائی دیتی تھی لیکن وہ شدتیں ناپید تھیں جو اسے دیواروں سے سر ٹکرانے پہ مجبور کرتی تھیں۔ اس کے لب سسکیاں دبا دبا کے صحرا ہو چکے تھے۔ آہیں بھر بھر کے اس کی سانس کے رستے زخمی ہو چکے تھے۔ لیکن چیخیں گونگی ہو گئی تھیں، دعائیں گنگ رہ گئی تھیں اور..... موت کی خواہش خود ہی مر چکی تھی۔

افراسیاب نے قسمت سے ہارے اپنے ماں جائے کو بانہوں میں بھینچ لیا۔ اپنے خون کی حرارت نے زریاب میں زندگی کے کچھ آثار پیدا کیے۔ اس کے حواس بحال ہوئے تو سب سے پہلے اسے یہ خیال آیا۔

"مجھے یہاں کیوں لائے ہو دراب؟ وہ باچا جان..... بی بی جان؟" اسے اندیشہ سا گزرا۔ "نہیں..... آہ..... اپنی ذات کے ساتھ الجھتے ہی اتنے برس گزار دیے، ان ہستیوں کا کوئی خیال تک نہ آیا جو اس ذات سے وابستہ ہیں۔" اسے ندامت نے آن گھیرا۔

"باچا جان اور بی بی جان۔ کیا وہ تمہیں اس حال میں دیکھ پائیں گے زریاب، بیس سالوں کا صبر ایک ہی پل میں کھو دیتے وہ تمہارا یہ حال دیکھ کر، کتنے بدل گئے ہو تم۔"

اس نے اپنے سامنے بیٹھے افراسیاب لالہ کو نظر بھر کے دیکھا جن کا کبھی وہ باچا جان کے بعد سب سے زیادہ احترام کیا کرتا تھا اور ان سے ڈرتا تو وہ شاید باچا جان سے بڑھ کے تھا۔ آج بھی ان کی شخصیت کے رعب کا وہی عالم تھا۔ بلکہ ہلکے بھورے بالوں میں جگمگاتے چاندی کے تاروں نے اور بھی دبدبہ قائم کر دیا تھا۔ سنجیدہ تاثر دیتی آنکھیں، کناروں پہ پھیلی لکیروں کے ساتھ اور بھی سنجیدہ نظر آ رہی تھیں۔

زریاب نے نظر اٹھا کے ذرا فاصلے پہ کھڑے دراب کو دیکھا۔ اس کا جسم پہلے کے مقابلے میں بھر چکا تھا۔ نوکدار مونچھیں تو اس کی پہلے سے تھیں اب داڑھی کا اضافہ بھی ہو چکا تھا۔ البتہ سر کے بال خاصے جھڑ چکے تھے، جن کی وجہ سے ماتھا اور کھلا کھلا لگ رہا تھا۔

Urdu.com
UrduPhoto.com
Saba

رنگت پہلے کی بہ نسبت سنولا چکی تھی۔

"شاید شکار کا شوق عروج پہ ہے۔"

زریاب نے اس کے کھردرے ہاتھوں اور سانولے ہوتے چہرے کو دیکھ کے اندازہ لگایا۔ دراب ایک بار پھر کرسی پہ بیٹھ گیا تو وہ مسکرایا۔ پچھلے دس منٹوں میں وہ چار بار اٹھ اور بیٹھ چکا تھا۔

"تو خان دراب خٹک اتنی تبدیلیوں کے بعد بھی ایک چیز ہے جو اب تک ویسی کی ویسی ہے۔ تمہاری طبیعت کا بے صبرا پن اور بے چینی"۔

"کیا سوچ رہے ہو لالہ؟" اس نے سوال کیا تو زریاب دونوں کے چہرے باری باری دیکھتا ہوا کہنے لگا۔

"آپ دونوں بھی تو کتنے بدل گئے ہیں۔ اتنے بڑے بڑے لگ رہے ہیں۔"

"صرف بڑے....." افراسیاب نے اسے احساس دلایا۔

"کبھی غور سے خود کو دیکھا ہے زر، تم بوڑھے دکھنے لگے ہو۔" زریاب نے بھائی کے ہاتھوں کی مضبوط اور محفوظ گرفت سے اپنا استخوانی ہاتھ آہستگی سے نکالا۔ لمبی لمبی انگلیوں پہ زرد کھال منڈھی تھی اور فراخ ہتھیلی مشقت کے تمام نشان سجائے ہوئے تھی۔ اس نے اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیر کے یہ سچ محسوس کرنا چاہا وہاں بھی جھریاں ہی جھریاں تھیں۔

سلوٹیں ہیں میرے چہرے پہ حیرت کیسی
زندگی نے مجھے تم سے زیادہ ہے سہنا

☆☆☆

خوشبو ہے، دھنک ہے چاندنی ہے
وہ اچھے دنوں کی شاعری ہے
بھیگے ہوئے پھول حرف اس کے
وہ رم جھم کی زباں میں بولتی ہے
باتوں میں، تھکن ہے شام جیسی
لہجے میں سحر کی تازگی ہے
چہرے پہ حیا کا روپ جیسے
دریا میں شفق گھل گئی ہے

برسا ہے خمار چاندنی کا یا
اس کی جبیں دمک اٹھی ہے
کیا جانے وہ کیسے مسکرائی
چہرے سے کرن چھن پڑی ہے
چہرے پہ بکھر کے زلف اس کی
سورج سے خراج مانگتی ہے
پل بھر کو سرک گیا جو آنچل
کلیوں کی طرح سمٹ گئی ہے
اے مشتریان حسن عالم!
وہ دونوں جہاں سے قیمتی ہے

خوشنود نے "طلوع اشک" بند کی اور سینے پہ دھر کے یونہی نیم دراز سوچنے لگا، خوشبو ہے، دھنک ہے، چاندنی ہے۔

خوشبو، دھنک اور چاندنی کا امتزاج بھی بھلا کہیں ہوا ہے..... ہزار بار یہ بات اس کے ذہن میں آئی تھی اس غزل کو پڑھ کر اور ہر بار ہی وہ سر جھٹک کے مسکرا دیا تھا۔ لیکن اب کون سی بات ہے جسے وہ جھٹلا رہا ہے۔ کیا اس کے مسکرانے سے کرنیں نہیں چھن پڑی تھیں؟

کیا اس کے لہجے میں سحر کی سی تازگی نہیں ہے؟ کیا اس کی جبیں چاندنی میں نہائی ہوئی نہیں لگتی؟

اور کیا وہ..... دونوں جہاں سے قیمتی نہیں لگتی؟

اور یہ آخری سوال وہ خود سے کر کے چونک گیا تھا۔

"کچھ تو اس میں ہے خوشنود جس نے تمہیں اتنا بے خود کر دیا ہے ورنہ جن حالات میں تم یہاں آئے ہو ان کی سنگینی کیا اس بات کی اجازت دیتی تھی کہ تم سب کچھ فراموش کیے آرٹ گیلری میں ایک مشکل سی الجھی ہوئی سی لڑکی کے پیچھے خوار ہوتے رہے؟"

اس کے دل نے اسے مزید کریدا تو وہ چپکے سے اقرار کر گیا۔

"ہاں..... کچھ نہیں بہت کچھ ایسا ہے جو مجھے اس کی جانب کھینچتا ہے۔ جو مجھے وقتی طور پر ہی سہی مگر بھلا دیتا ہے کہ میں یہاں کس لیے آیا ہوں۔ کاش کہ وہ بھی یہ جان لے کہ

Urdu.com
UrduPhoto.com
Saba

وہ کسی کے لیے کتنی ضروری بن گئی ہے۔" اس نے خدا سے دعا کی، کوئی معجزہ ہی ہوتا جو اسے مقدس کے آگے اظہار کی طاقت دے پاتا، ورنہ اس کی حد درجہ بے نیازی اور لاتعلق سا رویہ خوشنود کی ہمتیں پست کر دیتا تھا۔

پرواہ ہی نہیں اسے کسی کی
اپنے سے وہ کتنی اجنبی ہے
وہ غنچہ دہن سکوت زادی
کھلنے پہ بھی کم ہی بولتی ہے

☆☆☆

"تمہیں کیا میری بات کا بالکل بھی اعتبار نہیں رہا جو خود چلی آئی ہو۔" شناور اسے اپنے انتظار میں ٹہلتا دیکھ کے جل ہی تو گئی۔

"پھر کیا کروں میں؟" وہ بے بسی سے بولی۔

"تین دن سے تم یہی کہہ رہی ہو کچھ پتا نہیں چلا، کوئی خبر نہیں ملی۔ آخر کب تک میں ....."

"وہ اماں برکتے تو اب میری صورت دیکھ کے بھڑک جاتی ہے۔ ویسے جس انداز میں وہ جھنجھلاتی ہے میرے سوال پہ۔ اس سے مجھے تمہارا شک کچھ کچھ یقین میں بدلتا نظر آتا ہے کہ واقعی وہ جانتے بوجھتے انجان بننے کی کوشش کر رہی ہے۔ صبح بھی مجھے دیکھتے ہی رخ بدل کے دوسری جانب چل پڑی۔ صاف لگ رہا تھا مجھ سے چھپنے کی کوشش کر رہی ہے۔ بعد میں پتا چلا کہ کسی کام سے ہاسٹل سے باہر چلی گئی ہے۔"

"اوہ، تو تمہیں پیچھا کرنا چاہیے تھا ناں اس کا۔ کیا پتہ وہ اسی سے ملنے گئی ہو۔"

"پیچھا کرنا چاہیے تھا، پاگل ہوئی ہو کیا، اب میں مائیوں کا پیچھا کرتی پھروں۔" وہ بگڑ کے بولی۔

"تم سے کچھ نہیں ہوگا۔ اسی لیے میں خود آئی ہوں آج۔ کاش کچھ دیر پہلے آ جاتی تو..... مجھے یقین ہے وہ اماں ہم سے کچھ چھپا رہی ہے۔ لیکن میں بھی اس سے ضرور اگلوا کے رہوں گی۔ بس ایک بار مجھے پتا چل جائے کہ کیا واقعی وہ..... میری مما ہیں یا نہیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ کچھ کھاؤ پیو گی یا یہی باتیں کرنے آئی ہو؟" شناور نے اس کا دھیان بٹانا چاہا۔

"میرے پاس فی الحال اس موضوع کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ سچ پوچھو تو میں اس بار لاہور بھی صرف اس لیے آئی تھی شانو ورنہ جس ذہنی کیفیت سے میں گزر رہی ہوں اس میں کالج جانا محض وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوتا۔ لیکن مجھے خدشہ ہے کہیں میرا یہاں آنا اک کارزیاں نہ ثابت ہو۔"

"اُف خدایا' کس قدر مشکل الفاظ بولنے لگی ہو تم۔ غالباً تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ اگر وہ خاتون تمہیں نہ ملیں تو تمہارا لاہور آنا بے کار جائے گا، ہے ناں۔" وہ تصدیق کے لیے رُکی۔

"تو مائی ڈیئر کزن یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی بہتری ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس بار کے تمہارے لاہور کے سفر نے تمہاری تقدیر میں کچھ اور لکھ دیا ہو۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً....." وہ رُک کے سوچنے لگی کہ کہے یا نہ کہے حالانکہ یہ بھی غیر معمولی بات تھی کہ شناور اور کچھ کہنے سے قبل سوچنے کی زحمت کرے۔ پھر اپنی ازلی بے دھڑک انداز میں کہہ اٹھی۔

"مثلاً ڈاکٹر خوشنود۔ نہ تم لاہور آنے کا اتنا اچانک فیصلہ کرتیں، نہ ہم ہائی روڈ سفر کی مصیبت مول لیتے اور نہ ہی وہ..... مانوس اجنبی ٹکراتا۔"

"واٹ نانسنس؟ تمہیں پتا ہے تم کیا بک رہی ہو؟" حسب توقع مقدس کی گلابی رنگت غصے کی حدت پا کے انارکی ہو گئی۔

"سب پتا ہے۔" وہ اس کے بلند لہجے کے رعب میں قطعی نہ آئی۔

"اور تم جانتی ہو کہ تمہاری ہر بات کا پتا پہلے مجھے چلتا ہے بعد میں تمہیں۔ بلکہ جب تک میں تمہیں نہ بتاؤں تمہیں تو یہ بھی خبر نہ ہو کہ تم سوچ کیا رہی ہو اور چاہتی کیا ہو۔"

"تو تم بھی یہ سمجھتی ہو کہ میں تم پہ ڈیپینڈ کرتی ہوں۔" اس کے اس قدر درست اندازہ لگانے پہ مقدس تلملا گئی۔

"میں بھی.....؟" شناور "بھی" پہ زور ڈالتے ہوئے بولی۔

"تو گویا کوئی اور بھی ہے جو اس راز سے واقف ہے۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ بات کوئی ہو رہی ہو تمہیں ضرور بیچ میں اپنی بے ہودہ

Urdu.com
Sahar URDU PHOTO

ریسرچ پیش کرنی ہوتی ہے۔"

"تم چاہے اسے بے ہودہ کہو یا فضول۔ لیکن دیکھ لینا میری اس ریسرچ کا رزلٹ سو فیصد درست نکلے گا۔ ڈاکٹر خوشنود کا بار بار تم سے ٹکرانا بے مقصد نہیں ہے۔"

"مت بھولو کہ ہر بار میرے ساتھ تم بھی ہوتی ہو۔" اس نے باور کرایا۔

"میں تو نہیں بھولی، لیکن کیا کروں ڈاکٹر صاحب کو بھی یاد نہیں رہتا کہ تمہارے ساتھ، میں بھی ہوتی ہوں۔ بلکہ وہ تو تمہیں دیکھ کے شاید خود کو بھی فراموش کر دیتے ہیں۔"

"تم یہاں بیٹھ کے اس خود ساختہ فلمی کہانی میں رنگ بھرو اور چسکے لے لے کے سوچو جو بھی سوچنا ہے۔ کم از کم میرے سامنے یہ بات اب مت کہنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ سمجھیں۔" وہ بیگ کاندھے پہ لٹکا کے کھڑی ہوگئی۔

"ارے..... ارے رکو تو....." اور وہ رک گئی۔ شناور کی آواز پہ نہیں پارکنگ میں کھڑی سلور گرے کرولا سے اترتی اماں برکتے کو دیکھ کے۔ ڈرائیونگ سیٹ پہ اور کوئی نہیں، خوشنود تھا۔ اگرچہ اس کا چہرہ واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا پھر بھی اس کا دراز قد، اور غیر معمولی چوڑے شانے اسی کا شائبہ دلا رہے تھے۔ باہر کی طرف نکلتی مقدس نیم وا بڑے سے گیٹ کی اوٹ میں ہوگئی۔ اماں کار سے نکلنے کے بعد بھی ہنوز پچھلی سیٹوں سے کچھ سامان نکالنے میں مصروف تھی۔ آخر کار وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کے باہر نکلا۔ ڈارک گرے ٹو پیس سوٹ کے ساتھ بلیک شرٹ اور بلیک ٹائی میں وہ واقعی خوشنود تھا۔ اس نے جھک کے اماں کو سامان اٹھانے میں مدد دی دو شاپنگ بیگز میں زنانہ سوٹ تھے جو شاید استعمال شدہ لگ رہے تھے۔ باسکٹ میں تھرماس اور چند برتن، ایک ٹشو پیپر کے ڈبے کے ساتھ رکھے تھے۔ چند قدم آگے چلنے کے بعد اماں اچانک [illegible] آ گیا ہو، پھر اپنی عادت کے مطابق بلند آواز میں پوچھنے لگی۔

"میں کہیا پتر، اجے اس نے کچھ کھانا پینا تے نئیں، کہ میں سویرے یخنی تے دلیہ بنا لیا واں؟" (میں نے کہا بیٹا، ابھی اس نے کچھ کھانا پینا تو نہیں؟ یا پھر میں صبح یخنی اور دلیہ بنا لاؤں) نجانے خوشنود نے کیا جواب دیا تھا۔ مقدس اماں کو گیٹ کی طرف بڑھتے دیکھ کے پیچھے ہو جانے کی وجہ سے صحیح طرح سن نہیں پائی۔

"کون سے ہاسپٹل سے آ رہی ہیں آپ اماں؟"

مقدس نے اچانک سامنے آ کر اماں برکتے کو گڑبڑا کے رکھ دیا۔

"کدوں؟ میں کدوں گئی کتھے؟" (کب میں کب کہیں گئی ہوں؟) وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگیں۔

"آپ مجھ سے کیوں چھپا رہی ہیں۔ کیوں نہیں مجھے بتا دیتیں ان کے بارے میں۔" وہ قدرے بلند آواز میں بولی۔ شناور بھی قریب چلی آئی۔

"اور اماں، یہ شخص کون تھا، تمہارا کیا لگتا ہے؟ کہاں گئی تھیں تم اس کے ساتھ۔؟" اس نے بھی اماں برکتے کو گھیر لیا تو وہ بتھے سے ہی کھڑ گئی۔ اچانک مقدس کے حملے نے اسے چونکا ضرور دیا تھا، لیکن ذرا سنبھلنے کے بعد وہ پھر اپنی جون میں آ گئی۔

"پراں ہٹو کڑیو، تھانے دارنیوں، کتھوں آ گئیاں نیں میرے نال پچھ پریت کرن والیاں، تمیز ای نئیں رہی کسے نیں، ماما لگدا ایے او بندہ تہاڈا تے نانی لگنی آں میں جیہڑی تہانوں تسلی کراواں۔" (پرے ہٹو لڑکیوں، تھانے دارنیوں، کہاں سے آ گئی ہیں، مجھ سے پوچھ گچھ کرنے کے لیے۔ کسی نے تمیز نہیں سکھائی تمہیں۔ وہ تمہارا ماما لگتا ہے یا میں تمہاری نانی لگتی ہوں جو تمہارے سوالوں کے جواب دوں) وہ بری طرح جھڑکتی آگے چل پڑی۔

"لو کر والی عزت افزائی۔" شناور نے اسے جتایا۔

"ویسے یار، واقعی سوچنے والی بات ہے ڈاکٹر خوشنود کا اس مائی سے کیا تعلق؟ تمہارے پاس تو کارڈ بھی تھا ناں ان کا۔ اس بھڑکیلی اماں سے سر پھوڑنے کے بجائے تم انہی سے پوچھ لو۔ شاید کوئی سرا ہاتھ لگ جائے۔ نہ بھی ہو تو کم از کم تمہاری تسلی تو ہو جائے گی۔ ہو سکتا ہے وہ محض انسانی ہمدردی کی بنا پہ اسے لفٹ دے بیٹھے ہوں یا اس کی کسی [illegible] کا مفت علاج معالجہ کرا رہے ہوں۔" شناور کی عادت تھی وہ ہمیشہ مسئلہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے کئی ایک حل بھی بتا دیتی تھی۔ یا یوں کہیے کہ کسی بھی بات کے مثبت و منفی پہلو دونوں ہی سامنے رکھ دیتی تھی۔

"ڈاکٹر خوشنود علی وردگ۔"

کارڈ پہ لکھے نام پہ سرسری سی نگاہ ڈال کے وہ نیچے درج فون نمبرز کی جانب متوجہ ہونا چاہتی تھی لیکن خوشنود کے نام کے آگے لگے حوالے نے اسے منجمد کر دیا۔ خوشنود کا "وردگ" ہونا پُراسرار خاتون کا مومنہ ہونا، ثابت کر رہا تھا۔

"ہیلو ڈاکٹر خوشنود اسپیکنگ۔"

"ہیلو....." وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

Urdu Photo

"آپ....." اسے گمان سا گزرا لیکن اپنی خوش بختی کا اتنا یقین نہیں تھا کہ وہ پورے وثوق سے اس کا نام لے سکتا۔

"السلام علیکم" اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ اپنا تعارف کیسے کرائے۔

"وعلیکم السلام، مقدس؟" اس نے آس و امید سے چور چور لہجے میں پوچھا۔

"جی....." اسے اپنے ہونے پہ شرمندگی تھی یا پھر شاید فون پہ ہونے کی۔

"زہے نصیب، کہیے کیسے یاد کیا؟"

"مجھے آپ سے ایک کام تھا۔" وہ براہ راست اپنے مدعا پر آ گئی۔

"میری خوش نصیبی کہ اب آپ کو بھی مجھ سے کام پڑنے لگے۔" اس کا چہکنا مقدس کو ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا، اس نے چڑ کے موبائل آف کر دیا۔ خوشنود کے مسلسل مسکراتے لب یکدم سکڑ گئے۔

"تف ہے تم پہ ڈاکٹر وردگ، ایک لڑکی کا فون کیا آ گیا، باچھیں چیر چیر کے ڈائیلاگ جھاڑنے لگے، یہ احساس کیے بغیر کہ مخاطب ایک مقدس ہستی ہے۔" اس نے اپنے اندر گنگناتے جذبے کو ڈپٹا اور پھر سے اپنی سوبر و سنجیدہ جون میں آتے ہوئے سی ایل آئی پہ نمبر چیک کیا۔

"ہیلو" زندگی سے بھرپور آواز شناور کی تھی۔

"مس شناور میں ڈاکٹر خوشنود بول رہا ہوں۔ ابھی چند منٹ قبل اس نمبر سے مس مقدس نے مجھے کال کی تھی۔"

"جی جی..... وہ بس..... اچھا آپ بات کیجیے۔" اس نے زبردستی مقدس کے کان سے موبائل لگایا۔ شناور کی بے موقع مسکراہٹیں اسے زہر لگ رہی تھیں۔

"جی مس مقدس، کہیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔" دوسری طرف سے آتی سنجیدہ آواز نے اسے دوبارہ بولنے پہ آمادہ کیا۔

"میں صرف یہ جاننا چاہتی تھی ڈاکٹر خوشنود کہ اماں برکتے..... شناور کے ہاسٹل کی ملازمہ کے ساتھ آپ کون سے ہاسپٹل گئے تھے؟" بغیر کسی تمہید کے اس نے سوال کر دیا۔

"جی.....؟" حیران تو وہ پہلے ہی تھا کہ ریزروسی رہنے والی اس محتاط مزاج کی لڑکی کو اس سے کیا کام ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کے لہجے میں موجود استعجاب یہ ظاہر کر رہا تھا کہ مقدس کا یہ اچانک سوال اس کے گمان سے بھی باہر تھا۔ اس کو سنبھلنے میں چند سیکنڈ لگے لیکن وہ

دوسرے سوال سے خود کو روک نہ پائی۔

"اگر میرا سوال بہت زیادہ ذاتی نہ ہو تو کیا میں یہ جان سکتی ہوں کہ اماں برکتے کے ساتھ رہنے والی خاتون سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟" اس کے چبھتے ہوئے لہجے پہ وہ مزید ٹھٹھکا۔

"یہ سوال تو میں بھی کر سکتا ہوں، لیکن چونکہ آپ نے پہلے پوچھا ہے تو میں بتا دوں کہ میں شیخ زائد ہسپتال میں اپنے ایک دوست ڈاکٹر محمود غوری سے ملنے گیا تھا، وہاں ایک مریضہ کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ میرے علاقے کی ہیں اور ہم لوگ اپنے علاقے کی رعایا کا خیال رکھتے ہیں، یہ ہمارے بزرگوں کی روایات ہیں۔ محض انسانی ہمدردی اور کچھ اپنی ذات قبیلے کی ہونے کی وجہ سے، میں نے ڈاکٹر محمود سے ان کے علاج معالجے کی خصوصی درخواست کی اور ان اماں جی کو بھی صرف اخلاقاً ہی ہاسٹل تک لفٹ دے دی تھی۔ اب آپ یہ بتائیے کہ آپ کو اصل اعتراض کس بات پر ہے، ان اماں جی کو لفٹ دینے پہ یا ان اماں جی پہ توجہ دینے پہ۔"

وہ شاید اس توجیہہ کو مان ہی لیتی اگر خوشنود کا وردگ ہونا اس پہ کھل نہ گیا ہوتا۔ اس نے قصداً اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ وہ شیخ زائد ہاسپٹل میں کس وارڈ میں مل سکیں گی..... پلیز....." اس کے بے تاب لہجے میں جھلکتی التجا ڈاکٹر خوشنود کے کھٹکے ہوئے دل کو پھر سے چونکا گئی۔ اس نے کچھ سوچ کے کہا۔

"ایسا کیجیے آپ مجھے وقت بتا دیں میں آپ کو لے چلتا ہوں ان کے پاس۔"

"نہیں..... میں صبح دس بجے ہاسپٹل پہنچ جاؤں گی۔ آپ بس مجھے ان سے ملوا دیجیے گا۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہتے ہوئے لائن ڈس کنکٹ کی، دوسری جانب ریسیور ہاتھ میں لیے ڈاکٹر خوشنود کے چہرے پہ تعجب اور الجھن کے اثرات نمایاں تھے۔

☆☆☆

"زریاب.....!"

آج فجر سے ہی بی بی جان کے دل کو جیسے پتنگے لگے ہوئے تھے، کبھی ادھر کبھی اُدھر۔ اک عجیب سی بے چینی نے گھیر رکھا تھا۔ ظہر کی نماز ادا کر کے وہ آج اُوپر اپنے کمرے میں آرام کرنے چلی گئی تھیں، ورنہ ہمیشہ ہی وہ مغرب کے بعد اپنے کمرے کا رُخ

Urdu.com
Urdu Photo

کرتیں۔ ان کا ٹھکانا دن بھر لاؤنج میں بچھا وہ جہازی سائز تخت ہوتا جہاں سے وہ باآسانی دن میں کئی کئی بار اُٹھ کے باچا جان کے کمرے تک ہو آتیں۔ لیکن آج تو انہوں نے اپنے خان جی کے کمرے میں بس صبح ایک ہی بار جھانکا تھا۔ بستر پہ بے حس و حرکت پڑے لانبے مگر نحیف سے وجود کی گدلی آنکھیں چھت پہ لگے پنکھے پہ جمی تھیں۔

"خان جی!" انہوں نے آواز دی۔

"زریاب!" تھکی تھکی سانسوں پہ ڈولتا یہ نام ان بوڑھے لبوں سے آزاد ہوا اور منتظر بے بس آنکھیں دروازے کی طرف اُٹھ گئیں۔ بی بی جان کو دھچکا سا لگا اور پہلی بار..... پہلی بار وہ خان ارباب خٹک کو کوئی دلاسہ دیئے بغیر، کوئی خوش آئند خبر سنائے بغیر واپس لوٹ گئیں۔ آج تو انہیں خود کسی تسلی بھرے ہاتھ کی ضرورت تھی، مچلتے تڑپتے پہلو پہ اپنے تکیے پہ سر رکھا ہی تھا کہ پیچھے مردان خانے سے کچھ شور سنائی دیا۔ عموماً افراسیاب کے آنے پہ اس طرح بھگدڑ مچا کرتی تھی اس کی سرکاری گاڑی کے ساتھ گارڈز اور گن مین کا ایک ریلہ بھی تو ہوتا تھا انہوں نے لیٹنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اُٹھ کے بیٹھ گئیں۔ ابھی اپنی بڑی سی چادر پھیلا کے شانوں پہ ڈال ہی رہی تھیں کہ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا ان کی پرانی ملازمہ وگمہ حواس باختہ سی پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ اندر آئی۔ بی بی جان نے اس کی جسارت کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا۔

"ولے جنے؟" (کیا ہے لڑکی؟)

"زریاب لالہ راغلے۔" (زریاب صاحب آ گئے۔)

"ولے؟" (کیا؟) وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "سوخ زریاب؟" (کون زریاب؟)

"خاہ جی" (ہاں جی)

انہیں کچھ پتا نہ چلا کب وہ کمرے سے نکلیں کب سیڑھیاں اتریں اور کب وہ اس کے روبرو تھیں۔

"زریاب.....!"

انہوں نے سامنے کھڑے شکستہ وجود والے ہارے ہوئے انسان میں وہ شہزادوں کی سی چھب ڈھونڈنا چاہی۔ ان چمکتی آنکھوں میں ہر دم ہلکورے لیتا وہ معصومیت بھرا تجسس تلاشنا چاہا وہاں فقط ٹوٹے ہوئے آئینے کی کرچیاں تھیں۔ وہ متذبذب سے کھڑی رہ گئیں دل کسی طرح ماننے کو تیار نہ تھا یہ وہی خان زریاب خٹک ہے جسے وہ آنکھ بھر کے دیکھتے بھی

گھبراتی تھیں۔ مبادا اپنی ہی نظر لگ جائے۔ زریاب اپنا کرچی کرچی وجود خود ہی سمیٹ کے بی بی جان کے گلے لگ گیا۔ ان کے بازوؤں نے بڑھ کر اسے سمیٹا۔ ممتا کے گرم جوش سینے سے لگ کے برسوں سے ٹھنڈا پڑتا خون پھر سے اُبل پڑا۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اپنے ہی آنسو اس کے لیے اجنبی اجنبی سے تھے۔ وہ تو کب سے نہیں رویا تھا، کب سے نہیں ہنسا تھا۔ بلکہ اس نے تو بہت عرصہ پہلے ہی وہ سب کرنا چھوڑ دیا تھا جس سے اس کے زندہ ہونے کا احساس ہوتا۔ حضرتی بی نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھاما اور کپکپاتے لہجے میں کہا۔

"میں صبح سے سوچ رہی تھی کہ خان جی کا سامنا کیسے کروں۔ ان کی آنکھوں کے سوال اب مجھ سے ٹالے نہیں جاتے تھے۔ اللہ نے مجھ پہ کرم کر دیا اب میں خان جی کے پاس جاؤں گی، ان کا زریاب لے کر۔"

☆☆☆

طویل کوریڈور سے گزرتے ہوئے خوشنود اور مقدس دونوں ہی متضاد کیفیات کا شکار تھے۔ خود سے دو قدم کے فاصلے پہ جو وجود مقدس کا سمٹا سمٹا وجود خوشنود کو اک خواب سا لگ رہا تھا، اس کے ذہن میں بہت سے سوال کلبلا رہے تھے، لیکن ان مبہم سوالوں کو زبان دے کر وہ اس خواب سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ خواب اسے کہاں تک لے کے جاتے ہیں۔ اسلام آباد سے سنگاپور روانہ ہونے سے ایک روز قبل ہی اس خط کا ملنا شاید اس خواب کی تمہید تھی۔

لاہور پہنچنے سے قبل ہی اس اتفاقیہ ملاقات نے اسے پہلی بار اک خواب دیکھنے پہ اُکسایا۔

ابھی تو اس نے دل کی باتوں میں نہ آتے ہوئے خواب دیکھنے سے ہر ممکن احتراز کیا تھا کہ چند اور حادثاتی ملاقاتیں آنکھوں کو خوابوں کا ذائقہ زبردستی سونپ گئیں۔

اس کو خود سے ہمکلام ہوتے دیکھنے کا خواب.....

اس کے ہمراہ قدم بہ قدم چلنے کا خواب.....

اور.....اور وہ دیکھنا چاہتا تھا یہ خواب اُسے کہاں تک لے کے جاتے ہیں۔

مقدس کا ہر اُٹھتا قدم اس کے دل کو مٹھی میں جکڑ لیتا تھا۔ آج وہ ایک ایسی ہستی کو دیکھنے جا رہی تھی جو شاید کسی بھی انسان کی دنیا میں سب سے قریبی اور عزیز ترین ہستی ہوتی

UrduPhoto.com

آج سے کچھ دن پہلے اس نے بھولے بھٹکے بھی یہ تصور نہیں کیا تھا کہ وہ کبھی اس ہستی سے مل پائے گی۔..... اس ہستی کا اس دنیا میں وجود ہے بھی یا نہیں۔

اور پچھلے کچھ دنوں سے وہ اُٹھتے بیٹھتے، جاگتے سوتے، اسی ایک ہستی کو سوچ رہی تھی، اس کے پیکر کو تصور میں تراش رہی تھی اور آج..... آج..... محض چند قدم کے فاصلے پہ..... چند ساعتوں کے بعد وہ اس کے رُوبرو ہوگی۔ خوشنود کے تھمتے قدموں نے اسے بھی رُک جانے پر مجبور کیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا اور پھر اس کے اشارے پہ آئی سی یو کی گلاس وال کے آگے کھڑی ہوگئی۔

ایک..... دو..... تین اور نمبر تین بیڈ پہ اس کی متلاشی نظریں جم گئیں۔ آکسیجن ماسک سے ڈھکا وہ چہرہ صرف ایک ہی رُخ سے نظر آ رہا تھا لیکن مقدس کو اس چہرے سے آشنائی حاصل کرنے کے لیے ایک ہی نقش کافی تھا۔ وہ شیشے سے چپکی ہوئی چند قدم آگے سرکی لیکن وہاں سے یہ ادھورا عکس بھی نظر آنا بند ہوگیا وہ پلٹ کے پھر سے اپنی جگہ پہ آ گئی۔ خوشنود حیرت زدہ سا اس کی بے تابیاں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنا کارڈ دکھا کے ڈیوٹی پہ موجود نرس سے اجازت طلب کی اور اسے اندر لے آیا وہ کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے چلتی بیڈ نمبر تین کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

کھڑی مغرور ناک اور گداز کٹاؤ دار لبوں والے چہرے نے اتنے اثرات نمایاں نہیں کیے تھے جتنے کہ بیماریوں نے، یہ اس چہرے کی جھریوں سے پاک شفاف جلد سے ظاہر ہو رہا تھا۔ لیکن نیلے پڑتے ہونٹ، آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے اور ہاتھوں پیروں کا لاغر پن اس بات کا گواہ تھا کہ دل کا یہ شدید دورہ پہلا حملہ نہیں تھا اور ایک طرف کا رُخسار..... جلے ہوئے نشانات لیے نجانے کن کہانیوں کو چھپائے ہوئے تھا۔ اس نے ہولے سے اس چہرے کو چھونا چاہا۔ ان سیاہ پڑتے تھکے ماندے لرزتے پپوٹوں کے نیچے کیا اب بھی شہد کی جھیلیں آباد ہیں۔ اس کی آنکھیں برس پڑیں۔

"مما.....!"

اور..... خوشنود علی وردگ کا خواب ٹوٹ گیا۔

اپنے خیالوں میں گم کھڑی مقدس خوشنود کے چہرے کا بدلتا رنگ دیکھ سکی، نہ جھجک کے دو قدم پیچھے ہٹنا محسوس کر سکی۔ اس کی تمام تر حسیات تو سامنے موجود مومنہ علی کی طرف

متوجہ تھیں اپنے پیچھے لمبے لمبے ڈگ بھر کے واپس جاتے ڈاکٹر خوشنود کی طرف تو اس کا دھیان ہی نہ گیا۔

☆☆☆

"سب کچھ کتنا واضح تھا، بالکل صاف..... نجانے مجھے سمجھنے میں وقت کیوں لگا۔ اتنا وقت..... اتنے وقت میں تو اب..... اب کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا۔" پی سی میں بک اپنے کمرے میں آ کے خوشنود نے نئے سرے سے اس سارے قصے کو سمجھنا چاہا۔

"تو وہ ان کی بیٹی ہے، یعنی صرف ان کی نہیں بلکہ خان زریاب خٹک کی۔

کیا ضرور اسے ہی خٹک خاندان کی بیٹی ہونا تھا؟

اور کیا یہ بھی ضروری تھا کہ اس شخص کا حوالہ اس کے ساتھ ہوتا؟

اور ضروری تو یہ بھی نہیں تھا کہ ساری دنیا چھوڑ کے تمہارا دل ایک اسی لڑکی پہ آتا ڈاکٹر خوشنود علی وردگ.....

لیکن.....

تقدیر اپنے فیصلے، سارے نفع نقصان ذہن میں رکھ کے نہیں کرتی۔ اسے پیچیدگیاں پیدا کرنے کا شوق ہے۔ اچھی بھلی سیدھی سادی چلتی کہانی میں نیا موڑ لانا تو قسمت کی پرانی عادت ہے۔" وہ بے بسی سے آنکھوں پہ بازو رکھ کے اس حقیقت کو تسلیم کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ اس کے سوا اب اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ خون کا معاملہ تھا..... خون کا رنگ بدلا جا سکتا ہے نہ تاثیر۔

مقدس کی رگوں میں دوڑنے والا خون اس شخص کا تھا جس کے ہاتھوں میں فیروز علی وردگ کا خون لکھا تھا۔ اور فیروز علی وردگ کا خون خود خوشنود علی وردگ کے جسم میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

خون کی یہ تاثیر تھی کہ جس کے خوف سے اس کی ماں لالئی بی بی نے اسے اپنی آنکھوں سے دور کر لینا گوارا کر لیا۔ وہ ڈرتی تھیں کہ سید و شریف کی فضاؤں میں موجود فیروز کی جوان اور المناک موت کے نوحے کہیں کچے ذہن کے خوشنود کو اس راہ پہ نہ چلا دیں جس پہ چلنا پختون اپنی شان تصور کرتے ہیں ایسے میں وہ خود کو صرف ایک غیرت مند پختون کی حیثیت سے منوانا چاہتے ہیں، بھول جاتے ہیں کہ وہ کسی کا سہاگ بھی ہیں، کسی کی گود کا پھول بھی ہیں، کسی بہن کی تمام تر امیدوں کا مرکز بھی ہیں۔

Urdu Photo

فقط ایک فاتحہ اور ذرا سی زمین کی

طلب گار۔

مومنہ

اس نام سے تو وہ بخوبی واقف تھا اور اس نام کے ساتھ ایک اور نام بھی تازہ ہو جاتا تھا، خان زریاب خٹک کا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ خان زریاب کے ہاتھوں اس کے بابا جان کے ہاتھ مارے جانے میں اس عورت کا کردار کیا رہا ہے۔ وہ تو اتنا جانتا تھا کہ ماں نے ہمیشہ مومنہ نامی خاتون کا غائبانہ تعارف اس سے بڑے احترام اور محبت کے ساتھ کیا ہے۔ وہ اس محبت کی وجہ جاننے سے قاصر تھا۔ زریاب خٹک جیسے درندے سے اتنی نفرت تو پھر اس کی بیوی کا ذکر اتنے اچھے الفاظ میں کیوں؟

اب بھی ماں کا حکم نامہ پڑھ کے وہ الجھ گیا۔ اسے اپنی بی بی کی یہ بے مقصد سی خواہش سراسر فضول لگ رہی تھی۔ اگر وہ لب گور پڑی اس عورت کے کفن دفن کا بندوبست ہی کرنا چاہتی ہیں تو کسی بھی قابلِ اعتماد ملازمہ کے ہاتھوں یہ فریضہ ادا ہو سکتا ہے۔ جان محمد بھی یہ کام کر سکتا ہے۔ اس نے فون پہ ہلکا سا احتجاج کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اسے مسترد کر دیا گیا۔

''اس نے کسی اپنے کی خواہش کی ہے خوشنود داود کے بعد اس کی اولاد سے زیادہ اور کون اپنا ہو سکتا ہے۔ تم بحث میں وقت ضائع کرنے کے بجائے فوراً لاہور پہنچو، ہو سکتا ہے اسے تمہاری ہی ضرورت ہو اور اس کی سانسیں کچھ دن اور رہ جائیں۔''

بڑی ہی بے دلی سے وہ اپنا سارا پروگرام اپ سیٹ کر کے لاہور جانے کے لیے نکلا۔ وہاں دیے گئے ایڈریس پہ پہنچ کر ایک اجنبی زبان والی کرخت مزاج عورت مومنہ خاتون سے بڑی دقت کے ساتھ اپنا مدعا بیان کر پایا۔ وہ اسے لے کر سروسز ہاسپٹل لے آئی جہاں کوریڈور میں زمین پہ پڑی اس عورت کی حالت دیکھ کے وہ دہل گیا یہ تو وہ جانتا تھا کہ سرکاری ہسپتالوں میں غریبوں کا ''مفت علاج'' کس طرح ہوتا ہے، لیکن یہ اندازہ نہ تھا کہ اگر غریب کے ساتھ ساتھ کمسپرسی اور لاوارثی بھی ہو تو مریض کو اس طرح بے یار و مددگار ننگے فرش پہ مرنے کے لیے ڈال دیا جاتا ہے۔

اس وقت اسے کچھ یاد نہ رہا سوائے اس کے کہ وہ ایک ڈاکٹر ہے اور اس کے سامنے ایک ایسا مریض ہے جسے مریضوں کے لیے اس نے فیروز ہاسپٹل بنانے کا خواب دیکھا

ہے، شیخ زائد ہاسپٹل میں محمود غزنوی کو وہ جانتا تھا جو اس کے ساتھ لندن میں ہوتا تھا وہ وہ بچی کھچی سانسیں لیتے اس نڈھال سے وجود کو وہیں لے گیا۔ محمود کے دماغ میں بھی موت سے لڑنے کا سودا سمایا تھا۔ اس نے ایک چیلنج کی طرح اس مریضہ کو قبول کیا جس کا کینسر لاسٹ اسٹیج پہ تھا اور جو دل کے انتہائی شدید دورے کے بعد کوئی مناسب طبی سہولت میسر نہ ہونے کے بعد بھی زندہ تھی اور اسے مزید کچھ دن بھی زندہ رکھنا ایک امر دشوار تھا، لیکن شاید خدا نے اس کی عمر بڑھا رکھی تھی، یا اس کے حصے کے کچھ مزید تماشے دیکھنے رہتے تھے کہ خوشنود اور محمود کے اندر کے ضدی ڈاکٹر تھک کے ہار نہ مان رہے تھے۔

سنگاپور جانا، ہاسپٹل کے دیگر معاملات، خوشنود کو کچھ بھی نہ یاد رہا۔ رہی سہی کسر اتفاقیہ ملنے والی مقدس نے پوری کر دی۔ وہ اپنی زندگی کے اس نئے اور خوش کن موڑ پہ حد سے زیادہ حیران تھا۔ ابھی تو وہ دل میں پنپنے والے نئے نویلے سہانے سے جذبے کو محسوس کرنے کی کوشش ہی کر رہا تھا ابھی تو وہ آنکھوں کی پتلیوں میں ڈولتے اس عکس کے رنگ بھی نہیں گن پایا تھا کہ یہ ایک جھٹکا.....

اس کی ذہنی رو پھر سے چند منٹ پہلے ہاسپٹل میں پیش آنے والے واقعے کی طرف چلی گئی۔

''مما.....!'' یہ ایک لفظ اسے خود سے کتنی دور لے گیا تھا جو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی کتنی اپنی اپنی سی لگتی تھی۔

جب وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا تو اسے پانا کتنا سہل لگتا تھا۔

اور اب جب وہ اس کے بارے میں سب جان گیا ہے تو اسے سوچنا بھی ایک ناگوار سا محسوس ہو رہا ہے۔

یہ تو ٹھیک ہے کہ بدلے اور انتقام کی تپش اس کے دل تک نہیں پہنچ پائی۔ یہ بھی درست کہ اس کی مسیحائی کی طرف مائل فطرت کسی کا خون بہانے کا سوچ بھی نہیں سکتی اور یہ بھی ایک حقیقت کہ ماں کی تربیت اور اعلیٰ تعلیم نے اسے عداوت و حقارت کے جذبے سے کوسوں دور ہی رکھا لیکن پھر بھی..... پھر بھی کیا وہ اپنے اندر یہ تسلیم کرنے کی ہمت پا سکے گا کہ وہ اپنی باپ کے قاتل کی بیٹی سے محبت کرنے لگا ہے۔ ''نہیں ہرگز نہیں۔'' اس نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔

''میں کچھ بھی کر لوں اتنا اعلیٰ ظرف تو کبھی نہیں ہو سکتا۔'' اس نے خود سے ہار مان

urdu.com
URDU PHOTO

کے اپنی کمزوری تسلیم کی۔

ٹرن..... ٹرن فون کی بیل پہ اس نے اپنے حواس مجتمع کیے، دوسری جانب ڈاکٹر محمود غزنوی کی پرجوش آواز تھی "خوشنود علی، معجزہ ہوگیا..... میں اسے معجزہ ہی کہوں گا۔ تمہاری پیشنٹ مومنہ خاتون آج آئی۔ سی یو سے پرائیویٹ روم شفٹ کردی گئی ہے۔ انہیں ہوش آ گیا ہے۔ میرے خدشے کے برعکس وہ کومے میں نہیں گئیں اور نہ ہی ان کی ذہنی حالت کو کوئی فرق پڑا ہے تم چاہو تو ابھی ان سے مل سکتے ہو۔"

نڈھال سا پڑا خوشنود نئے سرے سے پرعزم ہوگیا۔ وہ یہاں ایک مرتی ہوئی عورت کی آخری خواہش پوری کرنے آیا تھا، لیکن قدرت نے اسے سالوں سے سربستہ رازوں سے واقف ہونے کا موقع فراہم کردیا۔ وہ اس موقع کو گنوانا نہ چاہتا تھا۔ چند ہی منٹوں میں وہ اس کے روبرو تھا۔

☆☆☆

وہ اپنے کمرے میں گھٹنوں میں سر دیئے زار و قطار روئے جا رہی تھی اور شناور اسے خاموش کرانے کی ہر کوشش میں ناکام ہو کے اب خود رو دینے والی ہو رہی تھی۔

"مقدس، اپنی جان لے لوگی تم یوں رو رو کے۔ آخر بتاتی کیوں نہیں کیا ہوا؟ کہاں گئی تھیں تم؟"

"میں ہاسپٹل گئی تھی شانو اور..... اور وہ میری مما ہی ہیں۔" اس نے بدقت چند الفاظ کہے اور پھر سے ہچکیاں بندھ گئیں۔

"وہی میری مما ہیں..... میں فوراً پہچان گئیں انہیں دیکھتے ہی۔ وہ مجھے دیکھ نہیں سکتیں ورنہ شاید وہ بھی مجھے پہچان لیتیں، لیکن نہیں..... پہچانتے تو انہیں [illegible] یاد [illegible] وہ بھلا کہاں یاد رکھ پائی ہوں گی کہ ان کی ایک بیٹی بھی ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟ اگر وہ تمہاری ماں ہیں تو پھر..... خیر یہ بتاؤ ڈاکٹر صاحب کیسے جانتے ہیں اماں مومنہ..... میرا مطلب ہے آنٹی کو۔؟" اس کے سوال کے جواب میں وہ چپ رہی۔

کچھ اندیشے تھے جو اسے کھل کے ماں کے ملنے کی خوشی بھی نہ منانے دے رہے تھے۔ وہ ان خدشات کا اظہار کر کے اپنی ذات کو کسی کی نظروں میں بے وقعت نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن مقابل شناور گل تھی جو اس کی تہہ سے بھی اصل بات کھوج لاتی۔ مسلسل سوال

کر کر کے اس نے یہ اگلوا ہی لیا کہ ڈاکٹر خوشنود علی، فیروز وردگ کا بیٹا ہے، اس فیروز وردگ کا جس کے بے لوث دوستی کے قصیدوں سے اس کے بابا جان کی ڈائری بھری پڑی ہے اور اس فیروز وردگ کا بیٹا جس کے ذکر سے اس کے گھر میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ جس کے نام کی دہشت سے بی بی جان اور تایا جان اپنے لاڈلے زریاب خٹک کی خیر مانگتے ہیں۔

"واٹ، ہاؤ سرپرائزنگ، کتنا افسانوی سا لگ رہا ہے۔ یوں پیچ در پیچ اتفاقات کی کڑی ملتے جانا۔ اس سے تو صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ قدرت خود تمہاری رہنمائی کر رہی ہے، وہ خود ان رازوں کو تمہارے سامنے کھولنا چاہتی ہے اور تم بے وقوف یوں منہ اُٹھائے واپس چلی آئیں کہاں تو ماں کی تلاش میں دیوانی ہو رہی تھیں اور کہاں ان کے ملتے ہی سب چھوڑ چھاڑ یہاں اندھیرے میں آنسو بہانے میں مگن ہو۔"

"تو کیا کرتی، میں جانتی ہوں اس اسرار کے پردے میں میرے لیے کوئی خوش کن انکشاف نہیں ہے۔ کاش مما مجھے ملتی ہی نہیں یا پھر..... یا پھر وہ مجھے زندہ نہ ملتیں۔" اس نے بے رحمی سے کہا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو؟"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ بابا کی ڈائری نے میرے ذہن میں ان کا ایک پیکر تراش دیا تھا۔ خاندان بھر کی باتوں کو نظر انداز کر کے میں نے انہیں ہمیشہ ہی اپنے تصور میں ایک [illegible] اور باوفا خاتون کی حیثیت سے سوچا۔ لوگ کیا کہتے ہیں مجھے کبھی اس کا یقین نہ آیا۔ لیکن [illegible] شانو..... تم خود [illegible]..... سارے زمانے سے کٹ کر..... اولاد اور شوہر کو بھلا [illegible] زندگی کے اس انتہائی موڑ پہ آج اگر کوئی ان کے پاس ہے تو اسی شخص کا بیٹا جس کا نام ان کے ساتھ اتنی ذلت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ میں ڈرتی ہوں شناور کہ کہیں یہ سب سچ ثابت نہ ہو جائے۔"

"خوامخواہ کے اندیشے ہیں تمہارے دل میں، میری یہ بات یاد رکھو مقدس زریاب کہ ادھورا علم ہمیشہ تکلیف دیتا ہے۔ اگر تم اس گتھی میں ہاتھ ڈال ہی چکی ہو تو اب اس کے تمام سرے سلجھانا تم پہ فرض ہے۔ اب سچ چاہے جو بھی نکلے اسے ہمت اور حوصلے کے ساتھ قبول کرو۔ لیکن پہلے سچ کی تلاش تو کرو ہو سکتا ہے سچ اس سے بالکل مختلف ہو جو تمہیں دکھائی دے رہا ہے۔ اب تک ایسا کتنا کچھ ہو چکا ہے جو تمہاری توقعات کے بالکل

Saba Urdu Photo

برخلاف ہے۔ پھر اب ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟ خود سے ہی منفی انجام فرض کر کے بیٹھ جانا حماقت ہے اور ماں جیسے رشتے پہ بغیر کسی واضح ثبوت کے اتنی بدگمانی سراسر گناہ ہے۔" اس کے سمجھانے بجھانے پہ وہ پھر سے نئی حقیقتوں کا سامنا کرنے پہ تیار ہوئی۔

☆☆☆

"فیروز لالہ....."

دھندلائی ہوئی آنکھوں سے سامنے موجود اونچے لمبے سراپے کو دیکھ کے اس کے لبوں سے سرسراتا ہوا نام نکلا۔ ہوش میں آنے کے بعد یہ پہلا مانوس چہرہ تھا جو اس نے دیکھا اور جسے دیکھتے ہی اسے احساس ہوا کہ شاید ہوش میں وہ اب بھی نہیں آئی ہے۔ بے یقینی سے پلکیں جھپک کے اس نے دوبارہ غور کرنے کی کوشش کی، وہ چہرہ اور قریب آیا۔

"میں خوشنود علی ہوں اور میری ماں نے کہا تھا کہ میں آپ کو پھوپھی جان کہہ کے پکاروں۔" بیڈ کے کنارے بیٹھ کے اس نے آہستہ آواز میں کہا تو اسے یقین آ گیا کہ وہ واقعی ہوش میں ہے۔ ڈرپس لگے ناتواں ہاتھ اٹھا کے اس نے اس چہرے کو چھونا چاہا۔

"خوشنود..... اتنا بڑا..... کتنا وقت گزر گیا..... آہ" اس کی ہلکی بھوری شہد رنگ آنکھوں کے گوشوں سے چند آنسو پھسل کے اس کے الجھے بالوں میں جذب ہو گئے۔ دھندلائی آنکھیں مسکرائیں۔

"تو تمہیں لالئی نے بھیجا ہے۔ میں نے اس سے کیا مانگا تھا اور اس نے کیا بھیج دیا۔ تم نے میری سزا اور بڑھا دی ہے لالئی۔ مجھے زندگی نہیں چاہیے تھی۔ مجھے چار پھولوں اور ایک عدد دعائے مغفرت کی حاجت تھی تم نے تو مسیحا بھیج دیا۔"

اس کا لہجہ حد درجہ صاف تھا۔ خوشنود کو حیرت ہوئی۔ خود اس کی ماں اردو پڑھنے لکھنے کے باوجود اتنی صاف اردو نہ بول پاتی تھی جب کہ یہ پہاڑی علاقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اتنی رواں اور شستہ اردو..... شاید لاہور اتنا عرصہ رہنے کی وجہ سے ہے۔

"میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں پھوپھو جان۔" مٹھی بھر ہڈیوں والا یہ بے بس وجود خود بخود اسے تکریم کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔

"آہ..... میں جانتی تھی کہ زندہ رہی تو ضرور کوئی نہ کوئی کچھ پوچھنے والا آئے گا۔ لیکن میرے پاس بتانے کو کچھ بھی نہیں، میں تو اب تک یہ بھی نہیں جان پائی کہ پھولوں کے رنگ کالے کیسے ہو جاتے ہیں۔ تمہیں کیا بتاؤں۔" اس کی ذہنی رو نجانے کہاں بھٹک گئی۔ وہ کچھ

نہیں سمجھا پھر کچھ لمحے رک کے پھر سے اپنا سوال دہرایا۔

"میں نہیں جانتا کہ خود کو چھپا کر رکھنے میں آپ کی کیا مصلحت تھی، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ آپ کے سینے میں چھپے چند حقائق بہت سی زندگیوں کو بھٹکنے سے بچا لیں گے۔ سالوں سے یہ سوال مجھے بے چین کیے ہوئے تھے۔ مختلف لوگوں کے پاس اس کے مختلف جواب تھے میں صرف سچ جاننا چاہتا ہوں۔ فیروز علی کا بیٹا ہونے کے ناتے مجھے اتنا حق تو ہے ناں۔" اسے بولنے پہ آمادہ دیکھ کے خوشنود نے مزید کہا۔

"سب ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ آپ کا بچ جانا ایک معجزہ ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ معجزہ صرف اس لیے رونما ہوا ہے کہ آپ سچائی کو دنیا کے سامنے لا سکیں۔"

"ہر سچ سامنے لانے کے لیے نہیں ہوتا۔ کچھ سچ کڑوے گھونٹ کی طرح پی جانا پڑتے ہیں۔"

"نہیں، کڑوا ہے کو پی جانا دانشمندی نہیں۔ اسے تھوک دینا چاہیے۔" خوشنود نے کہا۔

☆☆☆

وہ کمرہ جو عرصے سے موت کی آہٹیں سن رہا تھا یک بیک چہکاروں سے گونجنے لگا۔ خان ارباب خٹک کا اجڑا ہوا بیمار کمرہ آج آباد تھا۔ ان کا بلڈ پریشر لختِ جگر کو سامنے پا کے خوشی اور حیرت سے بلندی کو چھو رہا تھا۔ بوڑھا جھریوں زدہ چہرہ سرخ ہو کے دہکنے لگا تھا۔ جذبات کی زیادتی ان کی لکنت زدہ زبان کو اور بھی مجبور کر رہی تھی۔ وہ بار بار کچھ کہنے کی کوشش کرتے۔ زریاب باپ کا ہاتھ نم لبوں سے چوم کر رہ جاتا۔ ہر بار اس کی آنکھوں سے معافی کے خواستگار چند پشیمان سے آنسو ان کے ہاتھ تر کر دیتے۔

حضرتی بی بی کے چہرے سے وہ گھبراہٹ مفقود تھی جس نے گزشتہ کئی دنوں سے ان کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ خان افراسیاب اور خان دراب سرخرو سے کھڑے باپ بیٹے کے والہانہ ملن کو دیکھ رہے تھے۔ نئی نسل کے بہت سے نمائندہ جنہوں نے اپنے ہوش میں پہلی بار خٹک فیملی کے منجھلے بیٹے کو دیکھا تھا، فرطِ اشتیاق سے گھیرا بنائے کھڑے تھے۔

ان میں خان دراب کی بیگم بھی تھیں، واحد وہ تھیں جنہیں اس موقع پر مقدس کی غیر حاضری بری طرح کھل رہی تھی۔ وہ بار بار زریاب کے چہرے کی جانب دیکھتیں شاید اب وہ اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ پوچھے۔ انوشہ اور پلوشہ کو دیکھ کے اس کی آنکھوں میں

urdu.com
Sabha
URDU PHOTO

تجسس اور اشتیاق کی ایک لہر آتے ضرور دیکھی گئی تھی لیکن اب باچا جان کی ناگفتہ بہ حالت شاید اس کا دھیان بٹنے نہ دے رہی تھی۔

"جی باچا جان، کہیے، کیا کہنا چاہتے ہیں، میں آپ کا مجرم ہوں، جو کہنا چاہتے ہیں کہہ دیجیے۔ میں اس سے بھی زیادہ کا مستحق ہوں۔"

لاغر باپ کی بے بسی اور بے چینی محسوس کر کے زریاب نے دونوں ہاتھوں سے انہیں تھام کے خود کو سزا کے لیے پیش کیا وہ باپ کی اس حالت کا سراسر قصوروار خود کو سمجھ رہا تھا۔ باچا جان نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہ..... میں تم..... تمہارا..... تمہارا مجرم..... بس اس لیے زندہ..... تم..... تمہیں بتادوں..... معافی..... معاف کردو۔"

یہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ تمام افراد کو ساکت کر گئے شاید باچا جان کی ذہنی کیفیت نارمل نہیں۔ اس کا اندازہ کر کے افراسیاب خٹک نے انہیں آرام کا مشورہ دیتے ہوئے بی بی جان اور زریاب کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ لیکن ارباب خٹک نے التجائیہ انداز میں بیٹے کا ہاتھ تھام لیا اور منت کے ساتھ اپنی شریکِ حیات کو دیکھنے لگے۔

"نہ..... نہ جاؤ..... میں ایسے نہیں مرنا..... پہلے یہ بوجھ..... موت..... آسان..... کردو..... حضر..... حضرتی..... خدا کے لیے..... حضرتی..."

بی بی جان کا نظریں چرانا تینوں بیٹوں کو ٹھٹکنے پہ مجبور کر گیا۔ زریاب تو ابھی خود سوچنے سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا البتہ افراسیاب نے کسی انہونی کے خدشے کے پیش نظر بچوں اور خواتین کو باہر جانے کا حکمیہ اشارہ دیا۔ تائی جان سب کو لے کر خاموشی سے کمرے سے نکل گئیں۔ بی بی جان لرزتی ٹانگوں پہ ہاتھ [illegible] صوفے پہ [illegible]

"باچا جان کیا کہنا چاہتے ہیں بی بی جان؟" خان افراسیاب خٹک کے لہجے میں کچھ تھا جو حضرتی بی بی کے سرخ و سفید چہرے پہ زردی چھا گئی۔

"حضرتی..... بتادو..... تم..... تم کو اللہ کا واسطہ..... یہ اولاد..... کا بھلا..... گناہ..... گناہوں کا کفہ..... کفارہ..... سب بتادو..... اب تو سب..... کچھ..... بتادو....." بولتے بولتے وہ ہانپنے لگے۔ اچانک بی بی جان دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کے رونے لگیں۔ زریاب مچل کے اٹھا۔

"بس کریں بی بی جان..... خدارا یوں مت روئیں اور آپ لالہ..... آپ بھی

بس..... باچا جان بیمار ہیں..... کمزور ہیں ہم نہیں جانتے وہ کیا کہنا چاہ رہے ہیں آپ بی بی جان پر تو دباؤ مت ڈالیں وہ پہلے ہی پریشان ہیں۔"

"نہیں زریاب، میں پریشان نہیں، پشیمان ہوں..... خان جی ٹھیک کہتے ہیں کم از کم اب تو..... زندگی کے ان آخری دنوں میں اب تو مجھے سچائی سب کے سامنے لے آنی چاہیے۔ کاش میں نے پہلے ہی ان کی بات مان لی ہوتی تو اتنا کچھ نہ کھونا پڑتا۔ اک ذرا کچھ بچانے کے لیے میں نے سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ اپنا گھر، تمہارا گھر، تمہیں، خان جی کو..... اب بھی شاید میرے بتانے سے کچھ بچ جائے میرے پاس نہ سہی تمہارے پاس ہی سہی۔"

ان کی نظریں بیٹے کے سامنے جھکی ہوئی تھیں۔

"بی بی جان..... میں بہت شکستہ ہو چکا ہوں..... کچھ تاب لانے کی مجھ میں مزید ہمت نہیں نہ ہی یہ دل اب اور کوئی گھاؤ سہہ سکتا ہے۔ مجھے مزید مت الجھائیں میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ جو کہنا ہے صاف صاف کہیں۔"

☆☆☆

"میرا سب سے پہلا رشتہ اجنبیت کا تھا۔" مومنہ نے بتانا شروع کیا۔

"سب سے پہلے جو احساس میرے دل میں جاگا وہ اجنبیت کا تھا۔ جو فضا میرے آس پاس موجود تھی وہ اس فضا سے الگ تھی جس کی باس مجھے اپنے باپ سے آتی تھی۔ [illegible] جس زبان میں مجھے کلمے یاد کراتا تھا جو اس زبان سے الگ تھی جس میں میری ماں مجھے لوریاں دیتی تھی۔ اپنے گردوپیش سے یہ اجنبیت اور بڑھ گئی جب بہت پہلے میری [illegible] انتقال ہوا میرے باپ نے میرے گرد اپنا دائرہ اور محدود کر دیا وہ مجھے اجنبی ہواؤں، اجنبی صداؤں سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

میری ماں کالاش کے پہاڑوں کی رہنے والی تھی، کافر قبیلے سے تعلق تھا اس کا اور میرا باپ پنجاب سے تعلق رکھتا تھا، اپنی جوانی میں لاہور سے کالام گھومنے آیا اور میری ماں کا اسیر ہو کے یہیں کا ہو رہا۔

یہ وادی پیار محبت کے متوالوں کے لیے بڑی سازگار ہے۔ دیوار نہیں بنتی فقط چند پابندیاں لگاتی ہے۔ میرے باپ نے یہ پابندیاں قبول کر لیں جو اس وقت اسے بہت سہل معلوم ہوتی تھیں لیکن میری پیدائش سے وہ سہم گیا اس کے اندر کا مسلمان باپ فکر مند

urdu.com
URDU PHOTO

ہوگیا۔ وہ ہر وقت مجھے کافر رسم و رواج سے بچانے کی سعی میں مگن رہتا۔ میری ماں کی موت نے اس کے لیے واپسی کی راہ کھولی لیکن نجانے وہ کون سی نادیدہ بیڑیاں تھیں جنہوں نے اس کے پیر بمبوریت کی وادی سے باندھ دیئے تھے۔

میں اس وادی میں رہتے ہوئے بھی سب سے الگ تھی۔ سب سے کٹ کے رہنے میں جو اذیت ہے اس کا مزا میں آج سے نہیں لے رہی یہ تو میرے بچپن کا تجربہ ہے۔ تنہائی نے ایک نشے کی طرح ایک لت کی طرح مجھے جکڑ لیا۔ یہ تنہائی تب اور تکلیف دہ ہوگئی جب ابا بھی مجھے چھوڑ کے چلا گیا اس کے بس میں ہوتا تو وہ کبھی نہ مرتا۔ آخری دنوں میں ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور مجھے یہ شرمندگی کہ محض میری ذات کی وجہ سے ابا اپنے عشق کو غلطی کہنے پہ مجبور ہوگیا۔

مجھے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہوئی صرف میری وجہ سے اس لازوال عشق پہ یہ دھبا۔

ابا پچھتا رہا تھا کہ ماں کے مرنے کے بعد وہ کیوں نہ مجھے لاہور لے گیا۔ شاید اس کے رشتے دار بھی مجھے تسلیم نہ کرتے لیکن ابا کو یہ اطمینان تو رہتا کہ وہ کلمہ گو لوگوں میں اپنی بیٹی چھوڑے جا رہا ہے۔ میرے ہر طرح سے یہ یقین دلانے پر کہ میں ہر حال میں اسلام پہ قائم رہوں گی کسی کافر سے شادی نہیں کروں گی، ابا نے سکون سے آنکھیں موندیں بعد میں مجھے لگا ابا کے خدشے تقریباً بے بنیاد تھے، بستی کے لوگ جاہل تھے، کافر تھے، جنگلی تھے مگر پیارے تھے۔ جو پیار کرتے ہیں انہیں پیارے ہی کہا جاتا ہے ناں۔ کسی نے میرے ایمان کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔

میں اجنبیوں کے درمیان بھی بڑی سہولت سے زندگی گزار رہی تھی کہ ایک دن وہ آیا جسے پہلی نظر دیکھ کے ہی مجھے سالوں سے روز فجر سے مانگی اپنے دعاؤں کے پورا ہونے کا یقین آنے لگا۔ وہ زریاب تھا۔ جس نے ابا کی قبر پہ فاتحہ پڑھ کے مجھ سے اپنا رشتہ اور پکا لیا۔ میں اسے چاہنے لگی ویسے ہی جیسے کوئی بھی کسی کو چاہ سکتا ہے۔ بغیر کسی طلب کے، بغیر کسی چاہ کے، بغیر کسی صلے کے..... میں اسے چپ چاپ چاہتی رہتی تا عمر، چاہے وہ چاہتا یا نہ چاہتا، چاہے یہاں رہتا چاہے چلا جاتا۔ مجھے کوئی فرق نہ پڑنے والا تھا۔ لیکن ایک عجیب سی بات ہوئی اسے بھی مجھ سے چاہت ہوگئی۔ لیکن یہ ویسی چاہت نہ تھی جیسی کسی کو بھی کسی سے ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ضدی خان زادے کی چاہت تھی جو ہر من چاہی چیز کو اپنا

دیکھنا چاہتا ہے۔

میری محبت ایک بنجارن محبت تھی، عاجز، مسکین، ہر حال میں راضی خوشی رہنے والی صابر شاکر محبت اور اُس کی محبت نوابی تھی، جلالی تھی، طوفانی تھی سب بہا کے ساتھ لے جانے والی۔ اسے اس بات سے فرق پڑتا تھا کہ میں اس کی ہو کے رہوں یا اس وادی کی۔ یہ فخر مجھے اونچا کر گیا لیکن میں کم ظرف نہ تھی اپنے ابا کا حشر دیکھ چکی تھی۔ مرتے دم بھی اس کی آنکھوں میں جو پچھتاوے تھے اس نے مجھے محتاط کر دیا تھا اور میں نے عشق اور ذہن کو الگ الگ رکھنے کا فیصلہ کر رکھا تھا لیکن زریاب کے لیے عشق ہی سب کچھ تھا، عشق ہی سانس، عشق ہی آس، عشق ہی زندگی اور عشق ہی موت، وہ وصال کے بغیر عشق کو سوچنے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتا تھا۔

اس نے مجھے شادی کی پیش کش کی۔ میں چاہتی تو ایک جست لگا کر اس اجنبی دنیا سے نکل سکتی تھی لیکن میں نے اور بھی بہت کچھ سوچا۔ اگر میں زریاب کو اپنے اما کی طرح یہاں رہنے پر مجبور کرتی تو ایک بار پھر وہی کہانی دہرائی جاتی۔ میں جانتی تھی وہ اپنے عشق اور طلب میں اتنا دیوانہ تھا کہ سب عیش و آرام ترک کر کے میرے پاس پہاڑوں پہ بنے لکڑی اور گارے کے مکان میں زندگی گزارنے پہ تیار ہو جاتا لیکن میرا عشق اپنی ماں کی طرح خود غرض نہ تھا۔

میں جانتی تھی چند سال بعد اپنے خون کے رشتوں سے جدائی اسے ابا کی طرح ادھورا انسان بنا دے گی اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی دنیا میں میرے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ اس کے دل پہ شاید میں حکمرانی کر لوں لیکن اس کے گھر میں مجھے ایک ان چاہے فرد کی حیثیت حاصل رہے گی۔ مجھے اپنی انا اور ذات کا غرور ہمیشہ بہت عزیز رہا ہے۔ ان سربلند پہاڑوں اور اونچے پیڑوں کی سنگت نے اپنی ہی خوشبو پیدا کر دی تھی مجھ میں، مجھ سے کسی کی ٹیڑھی نظریں برداشت ہوتی تھیں نہ ہی کسی کی اُٹھی انگلی۔ مجھے اکیلا رہنا منظور تھا لیکن کم حیثیت زندگی نہیں۔ میں محبت کے بدلے رسوائی اور بے عزتی قبول کرنے پہ تیار نہیں تھی۔

میں نے اس سے شادی سے انکار کر دیا کیونکہ میں جانتی تھی وہ صرف مجھے محبت دے سکتا ہے اپنے اعلیٰ نسب گھرانے سے وقار نہیں دلوا سکتا۔ بے توقیر ہو کے رہنا مجھے منظور نہیں تھا اس لیے اس کی ہر درخواست میں نے رد کر دی۔ حتیٰ کہ ایک دن اس کا عزیز دوست

UrduPhoto.com
Saba
Urdu.com

فیروز اس کی حالت برداشت نہ کرتے ہوئے مجھے سمجھانے چلا آیا۔ بڑے ہی ولولے اور اپنائیت کے ساتھ وہ اپنے دوست کی وکالت کرتا رہا لیکن میرے نقطہ نظر واضح کر دینے کے بعد ایک دم چپ ہو گیا۔ مجھے لگا جو بات زریاب کو سمجھانے میں ناکام رہی ہوں، وہ بات فیروز سمجھ گیا ہے۔ میں نے اسے مزید قائل کرنے کی کوشش کی۔

''آج اجنبی لوگوں کی یہ بستی میری سرپرست تو ہے میں اسے چھوڑ کے زریاب کے ساتھ چل پڑوں تو بالکل ہی لاوارث اور بے سائبان کہلاؤں گی۔ زریاب کے دنیا میں صرف میں اور وہ ہی نہیں ہوں گے اس کا پورا خاندان ہوگا۔ اس بھری پری دنیا میں میں اپنی جگہ کس بل بوتے پہ بناؤں گی۔ محبتیں نبھانا آسان ہے لالہ رشتے نبھانا مشکل، میں زریاب کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی اور مجھ سے مشکل چیز اور کوئی نہیں ہے جسے سانس لینے کے لیے بھی عزت کی ضرورت ہے، عزت میری بھوک ہے لالہ، وقار میری پیاس ہے، محبت صرف عادت، عادت اور ضرورت کے بغیر رہا جا سکتا ہے بھوک اور پیاس سے کوئی کتنی دیر لڑ سکتا ہے۔ میں کم فہم یا خوش فہم نہیں ہوں جانتی ہوں میں ایک حقیر بے مایہ سی پہاڑن ہوں اور زریاب کے مقابلے میں تو بالکل ہی کچھ نہیں لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ زندگی کے ہر قدم پہ مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس دلایا جائے۔ ان بھاری کم حیثیت لوگوں میں میں بہت خوش ہوں۔ یہ لوگ مجھے جانتے ہیں میری ماں کو، میرے باپ کو، میری اور میرے خاندان کی تعظیم کرتے ہیں میں پورے وقار کے ساتھ اس بستی میں بغیر کسی دلی وابستگی، خونی رشتے اور محبت کے زندہ ہوں لیکن وہاں زریاب کی عالی شان حویلی میں میں کس حیثیت سے داخل ہوں گی۔''

''فیروز علی وردگ کی بہن کی حیثیت سے۔'' اس کے فیصلہ کن انداز نے مجھے چونکنے پہ مجبور کر دیا اور ابھی میں سنبھلنے نہ پائی تھی کہ اس کا مضبوط ہاتھ میرے سر پر ٹھہر گیا۔

''تم نے جتنی بھی بار مجھے لالہ کہہ کر پکارا مجھے خود پہ فخر محسوس ہوا ہے مومنہ۔ زریاب سے تمہارے متعلق بہت کچھ سنا تھا۔ لیکن خود تم سے مل کر احساس ہوا کہ تم کیسا نایاب گوہر ہو۔ جو عورت محبت پر عزت کو ترجیح دیتی ہو۔ جو آسائشات سے بھری زندگی محض وقار کے لیے ٹھکرا دینے کا حوصلہ رکھتی ہو۔ اس عورت کی عزت بھی کی جا سکتی ہے۔ آج اس لمحے میں نے اپنے دل میں تمہارے لیے بے پناہ عزت و احترام محسوس کیا ہے اتنا کہ جتنا میرے دل میں اپنی ماں کے لیے ہے۔''

اس کی انتہا پسندی مجھے ہواؤں میں اڑانے لگی۔

''لیکن تم مجھ سے چھوٹی ہو اس لیے میں تمہیں بہن کہوں گا۔''

''لالہ.....!'' سسکیوں کے درمیان میرے منہ سے فقط اتنا ہی نکل سکا۔ اس کا ہاتھ میرے سر پہ ہنوز آسمان کی طرح سایہ کیے ہوئے تھا۔ ابا کے بعد زریاب وہ واحد شخص تھا جس سے لگاؤ اور انسیت سے بڑھ کے کچھ محسوس کیا تھا میں نے، جس کی محبت کو پور پور اتار کر میں شانت ہو گئی تھی لیکن رشتہ اور مان محبت سے کہیں بڑھ کے طمانیت بخش ہوتا ہے یہ مجھے اب اندازہ ہوا۔ فیروز نے مجھ سے یہ مقدس رشتہ جوڑ کے مجھے معتبر کر دیا تھا۔

''اور ایک بھائی ہونے کے ناتے میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ تمہارا نکاح آج ہی خان زریاب خٹک سے کر دیا جائے گا لیکن اس سے پہلے کہ تم میری نیت پہ شک کرو میں یہ واضح کر دیتا ہوں کہ تم نکاح کے بعد میرے ساتھ میرے گھر چلو گی۔ زریاب کے والدین میرے پاس آ کر باقاعدہ تمہارا رشتہ طلب کریں گے اور میں ایک باپ کی طرح اپنے گھر سے تمہیں رخصت کروں گا۔'' اس نے بڑے استحقاق سے فیصلہ سنایا۔

''میں یہ عہد کرتا ہوں مومنہ علی کہ میرا گھر تمہارے لیے ہمیشہ میکے کی طرح آباد رہے گا چاہے میں رہوں یا نہ رہوں۔ اس گھر سے تمہیں میکے کا تمام تر مان اور وقار ملے گا۔ تمہارے نام کے ساتھ اب فیروز علی وردگ کا بھاری بھرکم حوالہ ہے۔ تم زریاب خٹک کے گھر کم حیثیت اور ان چاہے فرد کی حیثیت سے داخل نہیں ہوگی۔ یہ میرا، ایک خالص پختون زادے کا عہد ہے۔''

اور میں اس عہد پہ ایمان لا کے ہامی بھر بیٹھی، عورت بھی کتنی عجیب چیز ہے، محبتوں کے معاملے میں لاکھ شدت اور انصاف پسندی کا دعویٰ کرے، کہیں نہ کہیں ڈنڈی مار ہی دیتی ہے، میری ماں اپنے عشق میں اتنی سچی تھی کہ موت کو گلے لگا بیٹھی لیکن جیتے جی ابا کے لیے اپنے رشتے داروں کو چھوڑنے کا حوصلہ نہ کر سکی اور میں..... زریاب خٹک کے لیے..... اپنے محبوب کے لیے اتنی بے لوث ہو کر سوچتی تھی کہ خود کو تباہ کر لینا منظور تھا، اسے کسی امتحان میں ڈالنا گوارا نہ تھا، میں ڈرتی تھی میری شدت پسندی اور انا پرستی اس کے لیے مسائل کھڑے نہ کر دے اس لیے خود کو محروم کرنا گوارا کر لیا تھا میں نے اور فیروز خان اس کی بار میں کتنی خود غرض بن گئی..... یہ نہ سوچا کہ مجھے تحفظ دینے کا عہد کرنے والا کہیں کسی مشکل میں نہ پڑ جائے۔ اس نے میرا اعتماد بحال کیا اور میں نے بڑی آسانی سے اپنا

Urdu.com
UrduPhoto.com
Saba

ہر اچھا برا اسے سونپ کر خود کو بے فکر کر لیا۔ پھر وہی سب ہوا جیسا اس نے طے کیا تھا۔

چند مشکلات کے بعد سب ٹھیک ہو گیا۔ میں چند ہی دنوں میں بیاہ کر زریاب کی حویلی آ گئی اور پھر وہ دور شروع ہوا جو میری زندگی کا سب سے حیران کن دور تھا۔

تم جاننا چاہو گے کہ حیران کن کیسے؟ تو وہ اس طرح کہ میرے تمام تر خدشے بھربھری ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔ نہیں ایسا نہیں تھا کہ زریاب کے گھر والوں نے مجھے باآسانی اور کھلے دل کے ساتھ قبول کر لیا تھا۔ وہاں میرے لیے سرد مہری تھی، اجتناب تھا۔ زریاب کی بی بی جان مجھے مسلمان ماننے پہ تیار نہ تھیں وہ اور ان کی خاص ملازمائیں تک باقاعدہ مجھ سے کتراتیں۔ کوشش کی جاتی کہ میں اپنے کمرے تک محدود رہوں لیکن جانتے ہو حیران کن بات کیا تھی..... وہ یہ کہ یہ تمام اہانت آمیز رویے بھی مجھے بھڑکا نہ سکے۔ میں جو اس بات سے ڈرتی تھی کہ کہیں سرد رویے مجھے بے موت مار دیں ہر کسی سے انجان ہو کر رہ گئی عجیب کھوئے کھوئے دن تھے۔

مجھے سوائے زریاب کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا، کچھ سنائی نہ دیتا۔ کون مجھے ہندنی کہہ کے پکارتا ہے کون کافر کہہ کر، احساس ہی نہ ہوتا۔ مجھے برتنوں کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی لیکن مجھے اس میں بھی کوئی ہتک محسوس نہ ہوتی۔ میری نماز روزے کو ڈھکوسلا کہا جاتا، میں پروانہ کرتی، شاید اسی کو نشہ کہتے ہیں اور شاید اسی لیے تو بے غیرتی اور ذلت کہا جاتا ہے۔ نشہ چاہے محبت کا ہی کیوں نہ ہو ہمیشہ پستی کی طرف لے جاتا ہے۔ میں جو جنگلی پیڑوں کی طرح سربلند اور اکھڑ تھی، وادی کے بادلوں جیسی شفاف تھی، اتنی بے گانگی اور ذلت و تحقیر برداشت کرتی رہی، زریاب سے کبھی ایک لفظ تک نہ کہا۔ وہ پاس ہوتا تو مجھے کسی بات کا ہوش ہی کہاں ہوتا تھا۔

میں بنجارن تھی تو محبت بھی کشکول کے سکوں کی طرح گن گن کر کرتی تھی، حویلی میں آئی تو مٹھیاں بھر بھر کے نچھاور کرنے لگی۔ زریاب کی طرح میرا عشق بھی بلاخیز ہو گیا۔ میں..... مومنہ علی جو عزت کو اپنی بھوک اور تعظیم کو اپنی پیاس قرار دیتی تھی۔ اب سانس بھی لیتی تو صرف اس لیے کہ فضا سے آتی زریاب کی خوشبو کو اپنی نس نس میں اتار سکوں۔ زریاب کی دیوانگی بھی جوں کی توں تھی بلکہ جب سے اسے پتا چلا کہ میں ماں بننے والی ہوں وہ میرا پہلے سے بڑھ کے دھیان رکھنے لگا۔

انہیں دنوں زرسانگہ، زریاب کی بڑی بہن بھی ڈلیوری کے لیے میکے آئی۔ میری

اس سے پہلی ملاقات تھی۔ وہ زریاب کو بے حد عزیز تھی اس لیے میں نے بھی بڑی اپنائیت کے ساتھ اس سے ملنا چاہا لیکن اس کے رویے میں بھی میرے لیے سرد مہری اور گریز کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ جتنے دن رہی مجھ پہ طنز کے تیر تاک تاک کے چلاتی رہی۔

بی بی جان کا رویہ ایک خاموش اجتناب تھا لیکن ان کی بیٹی کے رویے کا جارحانہ پن مجھے کبھی کبھی نشے سے جھنجھوڑ ڈالتا تھا۔ میں نے پھر بھی اس کی تلخ مزاجی اور ترش روی کو اس کی صحت کی خرابی پہ محمول کرتے ہوئے نظر انداز کر دیا۔ بچی کی پیدائش کے بعد اس کی صحت مزید بگڑ گئی جس کی وجہ سے اس کا میکے میں قیام طویل ہوتا چلا گیا انہی دنوں فیروز لال کی بیوی لائی بی بی یعنی تمہاری ماں اپنی دیگر رشتہ دار خواتین کے ساتھ مجھے لینے آئی۔ وہ چاہتی تھی کہ فیروز کی خواہش کے مطابق میرے بچے کی پیدائش میرے میکے میں ہو۔ اس توجہ و عنایت پہ میں کھل اٹھی لیکن زریاب سے پل بھر کی جدائی مجھے قبول نہ تھی اس لیے جانے سے منع کر دیا۔

میری بچی مقدس اسی گھر میں اپنے باپ دادا کے گھر میں پیدا ہوئی۔ اس کا نام اس کی پیدائش سے پہلے ہی اس کے باپ نے سوچ رکھا تھا۔ جب وہ پیدا ہوئی تو ہو بہو میری تصویر تھی۔ زریاب نے کس بے بسی سے کہا تھا۔

"اب میں تم سے کہاں تک بچوں گا مومنہ۔ تم کتنے روپ بدل کے مجھے تسخیر کرو گی۔"

[illegible] سے میرا سر بلند ہو گیا۔ مقدس نے باپ کی توجہ بانٹ لی تو میرے بھی کچھ ہوش ٹھکانے لگے اب مجھے زریاب کے علاوہ بھی کچھ نظر آنے لگا۔ میں نے پہلی بار سنجیدگی سے گھر والوں کے الجھے رویے اور گریز کو محسوس کیا۔ غیر جانب داری سے سوچتے ہوئے مجھے کچھ قصور اپنا بھی نظر آیا۔ میں نے خود کو صرف اپنے شوہر تک محدود کر رکھا تھا صرف اس کی محبوبہ کی حیثیت سے یہاں رہ رہی تھی۔ میں نے ایک بہو ہونے کے ناتے خود کو منوانے کی کوشش کی ہی نہیں تھی، اگر بی بی جان مجھے کافر سمجھتی تھیں تو مجھے اپنی حیثیت ان پہ واضح کرنا چاہیے تھی، اپنی جگہ بنانے کے لیے کوئی قدم تو اٹھانا چاہیے تھا۔ میں نے حقیقت پسندی سے سوچتے ہوئے اپنا احتساب کیا۔

باچا جان مصر تھے کہ اس بار بیرونی ملک کاروباری دورے پہ زریاب ہی جائے جب کہ وہ میری اور اب ننھی مقدس کی کشش سے بندھ چکا تھا۔ میں نے ہی اسے جانے پہ

Urdu Photo

آمادہ کیا ایک بیٹا ہونے کے فرائض سے آگاہی دلائی۔ ایسا کر کے شاید میں خود ایک اچھی بہو بننے کی تیاری کر رہی تھی۔ بمشکل وہ جانے پہ تیار ہوا اس کے جانے کے بعد مجھے اپنے فیصلے کی سختی کا اندازہ ہوا۔ اس کے ساتھ نے کتنی تیز دھوپ مجھ تک آنے سے روک رکھی تھی۔ اس کے جاتے ہی جیسے بھانبھڑ جلنے لگے۔ زرسانگہ کے طعنے ناقابلِ برداشت ہوتے چلے گئے،۔ میرے اندر کی انا پرست پہاڑن پھر سے جاگنے لگی۔ اچھی اور قابل قدر بہو بننے کا ارمان کہیں سو گیا اور سمجھوتے کے تمام تر منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

زریاب کے ہمراہ وہ تمام رویے جو میں سرسری جان کے چھوڑ دیتی تھی، اب جان کو آ جاتے۔ میں نے تنگ آ کے اپنے کمرے تک محدود رہنا شروع کر دیا۔ یوں بھی گھر میں مجھے کوئی منہ لگانے پہ تیار نہ ہوتا تھا۔ بی بی جان مجھے دیکھتے ہی وضو کرنے چل پڑتیں۔ ملازمائیں ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اور دور رہتیں۔ چچا جان اپنے کمرے یا پھر مہمان خانے تک محدود رہتے۔ زریاب کے بڑے ابا شہر میں رہتے تھے ان کے گھر والوں سے میری سرسری سی ملاقات ایک آدھ بار ہوئی تھی،۔ ان کے رویے میں بھی کوئی خوش آئند جھلک نہ تھی۔ جب کہ زریاب کے چھوٹے بھائی سے میری کبھی ملاقات ہی نہ ہوئی تھی۔

زرسانگہ ابھی تک علیل تھی اور اس کی بدمزاجی اور چڑچڑا پن عروج پہ تھا۔ ہر ہفتے ان کا شوہر رحیم گل آفریدی اس سے ملنے آتا۔، ہر بار ہی دونوں میں کوئی نہ کوئی تلخی پیدا ہو جاتی جس میں میرے نزدیک سارا قصور زرسانگہ کا ہی ہوتا ہوگا کیونکہ رحیم گل بڑا مہذب اور پڑھا لکھا نوجوان نظر آتا تھا۔ وہ ہنس مکھ بھی تھا خوبرو بھی اور اپنی بیوی سے خاصا کم عمر بھی۔

مجھے تو بیچارے کی قسمت پہ افسوس ہی ہوتا تھا ایک تو بڑی عمر کی بیوی، اوپر سے جاہل، بدزبان اور کم شکل بھی۔ پورے گھر میں وہی تھا جو مجھے خشک خاندان کی بہو والا درجہ دیتا تھا۔ مجھے دیکھ کے تعظیماً کھڑا ہو جاتا، ادب سے سلام کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ جتنا میں زرسانگہ سے بچ کر رہتی رحیم گل کے آنے پہ اس سے ضرور ملتی۔ وہ تھا ہی ایسا عزت کرنے والا اور عزت کرانے والا۔

اس دن میں حد سے زیادہ بے زار اور اداس تھی۔ مقدس کو سلانے کے بعد میں نے زریاب کو خط لکھا، پہلی بار میں نے اس سے اس کے گھر والوں کے ناروا سلوک کا ذکر کیا۔

ورنہ اس سے پہلے میری کوشش ہوتی کہ جتنا وقت بھی وہ میرے پاس رہے ہمارے درمیان کسی دوسرے کا ذکر نہ آئے اور تکلیف دہ ذکر تو ہرگز نہیں۔ لیکن اس دن میں نے اپنی ہر تکلیف اس سے بیان کی۔ اپنی تنہائیوں محرومیوں کا ذکر کیا۔ کس کس طرح میری عزت نفس کو ٹھیس پہنچائی جاتی ہے سب لکھا۔ بیرون ملک خط پوسٹ کرنے کے لیے ظاہر ہے کہ پتہ انگریزی میں لکھا جاتا ہے جب کہ کوشش کے باوجود میں لکھا ہوا پتہ لفافے پہ ہو بہو نہ اتار سکی تو خط لے کر رحیم گل کے پاس چلی آئی۔ وہ رات ہی لکی مروت سے آیا تھا۔

"گل لالہ، ذرا یہ انگریزی کا پتہ تو اس لفافے پہ لکھ دو۔"

میں نے لفافہ اور قلم اس کے سامنے رکھا تو وہ سستی سے اُٹھ بیٹھا۔ رتجگا اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے چھلک رہا تھا۔ شب خوابی کا لباس بے شکن تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا اس نے ساری رات اسی کرسی پہ بیٹھے بیٹھے گزاری ہے، مجھے اس کی مضمحل حالت پہ افسوس ہوا۔

"کیا ہوا لالہ، طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تمہاری۔"

"کچھ نہیں بھابھی! بس سفر کی تکان ہے اور..... میری قسمت کا ہم سفر تکان اتارنے والا نہیں، بڑھانے والا ہے۔" اس نے انگلیوں سے اپنا ماتھا مسلتے ہوئے کہا رات بھی زرسانگہ کے کمرے سے کافی دیر تک تلخ و تند جملوں کی تکرار سنائی دیتی رہی تھی، میں ان کے درمیان موجود تلخی کی وجہ سے ناواقف تھی پھر بھی میری تمام تر ہمدردیاں رحیم گل کے ساتھ تھیں شاید اس کی وجہ میرے اور میری نند کے سرد تعلقات تھے۔

میں نے اس کا دھیان بٹانا چاہا۔

"چھوڑو لالہ، ذرا ذرا سی بات پہ یوں منہ لٹکانا مردوں کو زیب نہیں دیتا۔" میں اس سے چھوٹے بھائیوں کی طرح پیش آتی تھی شاید وہ مجھ سے عمر میں چھوٹا بھی تھا حالانکہ رشتہ اس کا مجھ سے بڑوں والا ہی تھا۔

"ہاں ٹسوے بہانا تو عورتوں کی عادت ہے نا۔ ذرا کوئی زیادتی ہوئی دریا بہا کے دنیا بھر کی ہمدردیاں سمیٹ لیں گی۔ مرد اپنی مردانگی کے زعم میں دل بھی ہلکا نہیں کر سکتے۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کے پتہ لکھنے لگا۔ میں نے یونہی رواداری میں کہہ دیا۔

"تو تم مجھ سے دل ہلکا کر لیا کرو۔ میں بھی تو تمہاری کچھ لگتی ہوں۔ یقین کرو تمہارے دل کی بات میرے دل تک ہی رہا کرے گی۔"

"ہائے اللہ جی، میں برباد ہو گئی..... یہاں تو دل سے دل تک بات پہنچ گئی۔"

urdu.com
URDU PHOTO

دھڑ سے دروازہ کھلا اور سینہ کوبی کرتی زرسانگہ اندر داخل ہوئی۔ رحیم گل سرخ چہرے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

"بکواس بند کرو زر۔"

"ہائے بی بی جی..... آپ بھی مجھے کوس رہی تھیں ناں کہ شوہر کو راضی نہیں رکھ پاتی اس لیے دو منٹ پاس بیٹھنا گوارا نہیں کرتا۔ آئیں دیکھیں ذرا اس کے پاس نہ بیٹھنے کی وجہ خود دیکھیں۔" اس نے شور مچا کے بی بی جان کو بھی بلا لیا ان کے ساتھ ساتھ وگمہ اور سرحدی جیسی ملازمائیں بھی لپک کے تماشا دیکھنے آ گئیں۔

"میں کہتا ہوں زرسانگہ، زبان قابو میں کر لو ورنہ....."

رحیم گل نے دھاڑ کے کہا لیکن اسے ذرا پروا نہ تھی۔

"اسی لیے بہانے بہانے سے روٹھ کے کمرے سے نکل آتا ہے۔ دوسرا اگر وہاں جادوگرنی نے جو آباد کیا ہوتا ہے۔"

میں سن ہو گئی۔ اس رکیک الزام نے میری قوت گویائی ہی سلب کر لی تھی۔ وہ زہر اگلتی رہی۔

"آدھی رات کو میں نے خود اسے بن ٹھن کے اس کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔ طبیعت بھری نہیں جو چند گھنٹے بعد پھر سے اندر گھس گئیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا اس کا منہ نوچ لوں لیکن قدم من من بھر کے ہو کر زمین سے اٹھ نہ پا رہے تھے [illegible] رحیم گل بھی بیوی کے سفید جھوٹ پہ ہکا بکا رہ گیا۔

"نہ بی بی..... ساری رات میں خود زریاب دلہن کے پاس تھی۔ بچی کو بخار آ رہا تھا، بی بی تو ہلی تک نہیں کمرے سے۔" سرحدی نے خوف خدا سے لرز کے گواہی دی۔

"تو..... بڈھی چڑیل....." زرسانگہ نے عمر رسیدہ ملازمہ کو جھپٹ لیا [illegible] نوچتے ہوئے وہ بے تحاشا چیخنے لگی۔ بی بی جان بیٹی کی دیوانگی پہ ہراساں ہو گئیں۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں چڑھ چکی تھیں، بدن پہ لرزہ طاری تھا اور منہ سے کف بہہ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہے لیکن پھر بھی مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس سے گھن محسوس کر کے منہ پھیر لیا۔

"وگمہ..... اسے سنبھالو..... نجانے کیسا دورہ پڑا ہے بچی کو جب سے بیاہ ہوا ہے کملا کے رہ گئی ہے نجانے کیسا کسی نے تعویذ پھونکا ہے بیڑہ غرق کر کے رکھ دیا ہے معصوم بچی کا۔"

"ہونہہ معصوم بچی....." رحیم گل نے تنفر سے کہا اسے بی بی جان کا بیٹی کے لیے یوں فکر مند ہونا بالکل پسند نہ آیا، انہوں نے داماد اور بہو کے یوں بے عزت ہونے پر اک لفظ تک نہ کہا اور کچھ کہا بھی تو بیٹی کے لیے۔

"دورہ نہیں پڑا..... ڈرامے کرتی ہے پاگل بن کے۔ تاکہ جو مرضی آئے کرتی پھرے کوئی کچھ کہہ نہ سکے کہ بیچاری پاگل جو ہے۔" رحیم گل نے غصے سے کہا۔

"میں پاگل ہوں؟ میں پاگل نہیں ہوں تم مجھے پاگل کر دو گے؟"

"میری بچی پاگل نہیں رحیم گل۔" بی بی جان نے سخت لہجہ میں کہا۔ رحیم گل آس پاس پڑی چیزوں کو ٹھوکر مارتا غصے سے کمرے سے نکل گیا۔ میں کسی بے جان چیز کی طرح کونے کی دیوار سے سہمی چپکی کھڑی تھی۔ یہ تماشا میرے گمان سے بھی باہر تھا۔ زرسانگہ کی اکثر حرکتیں مجھے عجیب سی لگا کرتیں لیکن وہ اس حد تک جنونی بھی ہو سکتی ہے مجھے اندازہ نہ تھا۔ اس نے تو شوہر کے ساتھ ساتھ، مجھے..... اپنے بھائی کی عزت کو بھی دو کوڑی کا کر دیا۔

غم و غصے نے مجھ سے اتنی ہمت بھی چھین لی تھی کہ میں بھی رحیم گل آفریدی کی طرح اس کمرے سے نکلنے کا سوچتی اور شاید میری بدقسمتی تھی کہ میں اس کمرے میں موجود تھی۔ زرسانگہ نے نفرت سے مجھے دیکھا اور اپنا آپ چھڑا کے مجھ پہ جھپٹی۔ اس نے میری چادر کھینچ کے پھینک دی اور گریبان سے پکڑ کے مجھے زمین پہ لا پھینکا۔ میرے بٹن ٹوٹ کے بکھر گئے میں اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھی اس لیے سنبھل تک نہ سکی اور آسانی سے [illegible] اس نے میرے بال نوچ کے مجھے گھسیٹنا چاہا۔ بی بی جان کے کہنے پر [illegible] آگے بڑھیں لیکن تب تک اس نے میرے منہ پہ طمانچے مار مار کے میرے رخسار سوجا دیے تھے میری ناک سے خون بہہ رہا تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ میری چیخ و پکار میرے اندر ہی کہیں دفن ہو رہی تھی۔ اس قدر ذلت مجھے فریاد کرنے بھی نہیں دے رہی تھی وگمہ اور سرحدی نے اسے پکڑ لیا لیکن اس نے زور سے لات مار کے میری پسلیوں پہ وار کیا۔ میں درد کی شدت سے دوہری ہو گئی۔

"کافرن..... ہندنی ایک مرد سے تیری تسلی کہاں ہوتی ہو گی۔ چھوڑ میرے بھائی اور شوہر کا پیچھا چلی جا اپنے منحوس پہاڑوں پر وہاں رواج ہو گا چار چار مرد رکھنے کا آزادی سے عیش کرنا۔"

"کافرن ہو گی تو....." میں پھٹ پڑی۔

Urdu.com
Urdu Photo

"میں مومنہ ہوں..... مومنہ..... خان زریاب کی من چاہی بیوی..... مجھے چار مردوں کا طعنہ دینے والی ڈائن۔ خوایک مرد کے قابل بن کے تو دکھا مجھے۔" میں مزید چپ نہ رہ سکی میری للکار پہ اس نے خود کو چھڑایا۔ لپک کے آتش دان سے جلتی لکڑی نکالی۔ اس کا تیور بھانپ کے میں نے خود کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن میں خود کو مکمل طور پہ اس سے محفوظ نہ رکھ پائی۔ میرے چہرے پہ اس نے جلتی لکڑی رکھ دی۔"

اس وقت کی تمام تر اذیت مومنہ کے لہجے میں اُتر آئی۔ خوشنود آنکھوں میں درد لیے اس نڈھال چہرے کے اس سیاہ پڑے حصے کو دیکھنے لگا جہاں ایک بے رحم داغ پہ چند آنسو سرک رہے تھے۔

"میرے چہرے پہ اس نے جلتی لکڑی رکھ دی۔"

مقدس کے قدم اس ایک جملے نے باندھ دیے۔ وہ آئی سی یو سے ہوتی ہوئی اس کمرے تک آ رہی تھی۔ کمرے میں خوشنود کو پا کے وہ ٹھٹکی۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اس کی موجودگی میں اندر چلی جائی یا چپکے سے واپس لوٹ جائے کہ ماں کی آواز نے اس کا دھیان کھینچ لیا۔ وہ درد میں ڈوبی اس آواز میں گرفتار سی ہو کے دروازے کے ہینڈل پہ ہاتھ رکھے وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ سنسان کوریڈور میں کوئی ذی روح نہ تھا۔ ہاسپٹل کے پرسکون ماحول میں دروازے کے اس پار کھڑی مقدس تک مومنہ کی گفتگو بخوبی پہنچ رہی تھی۔

"میرے چہرے پہ اس نے جلتی لکڑی رکھ دی۔"

مقدس کے رخسار دہکنے لگے۔ اس نے شدت ضبط سے لب کچل ڈالے۔ مومنہ نے گفتگو کا سلسلہ پھر شروع کیا۔

"وہ رات بڑی ظالم تھی۔ ساری شام میں نیم بے ہوشی کے عالم میں اسی کمرے کے ایک کونے میں پڑی رہی تھی۔ جب ہوش آیا تو ایسا محسوس ہوا جیسے میرے گال کو کوئی چھیل رہا ہے۔ میں نے سوجی ہوئی آنکھیں بمشکل کھولیں۔ سرحدی ہاتھ میں مرہم کی پیالی لیے کھڑی تھی۔ برستی آنکھوں کے ساتھ اس نے ہی شاید میرے جلے ہوئے رخسار کو صاف کرنا چاہا تھا اور درد کی تیز لہر مجھے گھنٹوں کی بے ہوشی سے کھینچ لائی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پرے کیا۔ مجھے اس کے اور دیگر ملازماؤں کے سامنے ہونے والی تذلیل یاد آ گئی۔ اب ان ہمدردیوں سے اس کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے گرتے پڑتے اپنی چادر اٹھائی، ڈولتے قدموں سے کمرے سے نکلی۔ سرحدی نے مجھے سہارا دینا چاہا لیکن میں نے اسے جھٹک دیا اس وقت مجھے سب سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

رات گہری ہو چکی تھی، مقدس بستر پر لیٹی کلکاریاں بھر رہی تھی۔ سرحدی کی گیارہ سالہ پوتی اسے کھلا رہی تھی۔ مجھ پہ نظر پڑتے ہی وہ سراسیمہ ہو گئی۔ جھنجھنا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ الٹے قدموں کمرے سے نکل گئی، مقدس اس کو نظروں سے اوجھل پا کے رونے لگی۔ میرے کانوں تک اس کے رونے چلانے کی آواز بہت دور سے کہیں آ رہی تھی، میں نے خالی خالی نظروں سے اسے بستر پہ ہاتھ پیر پٹخ کے روتے دیکھا لیکن میرے اندر کوئی تحریک پیدا نہ ہوئی میرا پورا وجود برف ہو رہا تھا صرف آدھا چہرہ جیسے شعلوں کی زد میں تھا۔ میں اس کے برابر لیٹ گئی۔ سرحدی نے آہ بھر کے مجھے دیکھا اور مقدس کو دودھ کی بوتل اور کھلونے سمیت اٹھا کے باہر لے گئی۔ جاتے جاتے وہ میرے سرہانے مرہم رکھ گئی۔ کئی گھنٹے ایسے پڑے رہنے کے بعد میں اٹھی اور آئینے میں خود کو دیکھنا چاہا۔ میری چیخ نکل گئی۔ میرے گال سے چربی باہر نکلی ہوئی تھی۔ آنکھ تک جلد جھلس چکی تھی۔ رو رو کے میرا گلا بیٹھ گیا۔ دن چڑھے تک میں بھوکی پیاسی، بخار میں جلتی، درد سے تڑپتی اکیلی پڑی رہی۔ پھر میں نے ایک فیصلہ کیا۔

زریاب کے آنے میں ابھی کئی دن تھے۔ اتنے دن تک میں یوں بے یار و مددگار نہیں رہ سکتی تھی میں جانتی تھی اس سنگلاخ حویلی میں کوئی ایسا نہیں جسے میں اپنا کہہ سکوں، کوئی میری تکلیف بانٹنے نہیں آئے گا۔ کوئی مجھے سنبھالنے نہیں آئے گا، اس طرح تو میں ختم ہو سکتی تھی جب کہ مجھے زندہ رہنا تھا مقدس کے لیے زریاب کے لیے، مجھے خود اپنے لیے کچھ کرنا تھا۔ زرسانگہ نے مجھے اکیلا جان کے میرے ساتھ یہ ستم ڈھایا۔ بی بی جان مجھے لاوارث سمجھ کے یہاں مرنے چھوڑ گئیں، لیکن میں ان سب کو بتا دوں گی کہ میں لاوارث نہیں..... بے یار و مددگار نہیں۔

مجھے فیروز لالہ یاد آئے اور ان کا عہد بھی میرے اندر ایک توانائی سی بھر گئی۔ میں نے اپنے زخم کو مرہم سے ڈھانپا۔ گرم دودھ منگوا کے پیا۔ ذرا ہمت آ جانے پہ سرحدی کی مدد سے مردان خانے جا کے فیروز لالہ کو فون کیا۔ میری سسکیاں انہیں احساس دلا گئیں کہ بات غیر معمولی ہے اس لیے تین گھنٹے میں ہی وہ میرے پاس موجود تھے۔ میری حالت دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے۔

"مومنہ..... تم..... یہ سب کیسے ہوا؟" وہ گمان بھی نہ کر پائے کہ یہ سب کس نے کیا ہوگا اور جب میں نے خود پہ پڑنے والی افتاد کا ذکر کیا تو وہ چند لمحے بے یقینی سے بیٹھے رہے پھر ان کی آنکھیں غیرت کے مارے لہو رنگ ہو گئیں۔

Urdu Point

"اس گھر میں فیروز خان وردگ کی بہن پہ اتنا گھٹیا الزامات لگائے گئے۔ کیا یہی سب وہ خوشیاں تھیں جنہیں دکھانے کا وعدہ کر کے زریاب تمہیں یہاں لایا تھا۔ وہ میرا دوست ہے لیکن اب میں بھول جاؤں گا کہ وہ میری بہن کا شوہر ہونے کے علاوہ اور بھی کوئی رشتہ رکھتا ہے اسے اس رشتے کے تمام تقاضے پورے کرنا ہوں گے۔"

"نہیں لالہ زریاب کا کوئی قصور نہیں وہ کچھ نہیں جانتے۔ وہ تو جب مجھے اس حالت میں دیکھیں گے تو نجانے کیسا محسوس کریں گے۔ یہ سب ہوا ہی ان کی غیر موجودگی کی وجہ سے ہے۔ اگر وہ یہاں ہوتے تو کس کی مجال تھی مجھے ہاتھ لگانے کی، میری چادر کھینچنے کی، مجھ پہ گندے الزامات لگانے کی۔"

"ٹھیک ہے وہ تمہارا شوہر ہے، تمہارا سائبان ہے لیکن باقی افراد سے بھی تمہارا کوئی نہ کوئی رشتہ ہے۔ سب پہ تمہاری حرمت فرض ہے۔ شوہر کی غیر موجودگی میں تمہارا بے سائبان اور غیر محفوظ ہونا ثابت کرتا ہے کہ زریاب تمہیں یہاں تمہاری شایان شان حیثیت نہیں دلا سکا۔ میں بات کرتا ہوں باچا جان سے، وہ جو چل کے آئے تھے، تمہیں بیاہنے، تمہارے والی ہیں تمہارے سرپرست۔"

وہ میرا ہاتھ تھام کے باچا جان کے کمرے میں لے گئے۔ بستر پہ نیم دراز باچا جان سنبھل کے بیٹھ گئے۔

"السلام علیکم باچا جان" فیروز لالہ نے غصے کی آخری حد میں بھی تعظیم یاد رکھی۔

"آؤ فیروز آؤ۔" انہوں نے درزدیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے فیروز لالہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شاید انہیں میرا یوں کمرے میں گھسے چلے آنا پسند نہیں آیا تھا۔ اب تک ان کی کسی بہو کو اتنی جسارت نہ ہوئی تھی کہ وہ بلا اجازت ان کی خلوت میں خل ہوں۔

"باچا جان میں صرف آپ سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ کیا خٹک خاندان میں عورت کی عزت صرف ماں، بہن اور بیٹی کے رشتے کے حوالے سے کی جاتی ہے؟ کیا بیٹے کی عزت گھرانے کی عزت نہیں کہلائی جاتی اور کیا بہو کو بیٹی والی تعظیم نہیں مل سکتی۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو فیروز۔" باچا جان کے لہجے سے ناگواری جھلک اٹھی۔

"صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں باچا جان" اس نے میرے چہرے سے چادر سرکا کے مجھے آگے کیا۔ باچا جان میرے چہرے پہ یہ گہرا نشان دیکھ کے حیرت زدہ رہ گئے۔

"یہ سب کیسے ہوا اور کب؟"

"آپ یہ پوچھیے باچا جان کہ یہ سب کس نے کیا اور کیوں؟ اس لیے کہ یہ نشانات

حادثاتی نہیں ہیں۔ آپ کی صاحبزادی نے نا صرف اپنی بھابی پہ جسمانی تشدد کیا ہے بلکہ نہایت بے رحمی سے رکیک ترین الزامات بھی لگائے ہیں جو اس خاندان کی بہو کے حوالے سے مومنہ کے لیے انتہائی شرمناک ہیں۔"

"اس نے کوئی الزام لگائے ہیں نہ ہی تشدد کیا ہے۔" بی بی جان کمرے میں چلی آئیں۔

"نند بھاوج کے جھگڑے کس خاندان میں نہیں ہوتے۔ بس کل بات ذرا زیادہ ہی بڑھ گئی اور وہ بھی سب اس کی وجہ سے ہوا۔ یہ پہاڑوں کی رہنے والی زبان دراز گنوارن، خاندانی طور اطوار کیا جانے۔ اس کی زبان..... توبہ توبہ..... زرسانگہ بھی مشتعل ہوگئی۔"

"یہ محض نند بھاوج کا جھگڑا نہیں تھا بی بی جان۔ بلکہ یہ جھگڑا ہی نہیں تھا۔ جھگڑا دو طرفہ ہوتا ہے۔ یہ تو زیادتی تھی جو آپ کی بیٹی کی طرف سی ہوئی ہے۔ ظلم ہے جو اس نے میری بہن پہ توڑا ہے، وہ جھوٹ نہیں کہہ رہی ہے۔"

"تو کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں؟" بی بی جان کو جلال آ گیا۔ فیروز لالہ نے نظریں جھکا لیں۔ "آپ میری بزرگ ہیں میں آپ کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کرنا چاہتا لیکن خدا کے لیے اپنی بزرگی کا مان رکھ لیں۔"

"سچ کیا ہے حضرتی؟" باچا جان گرجے بی بی جان نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن ہکلا کے رہ گئیں۔ سچ کہنے کی ہمت نہ تھی اور جھوٹ وہ اپنے خان جی کے سامنے بول نہیں سکتی تھیں۔

"زرسانگہ کہاں ہے؟" وہ بولے۔

"وہ بیچاری تو کل سے بیمار پڑی ہے۔ اپنی سدھ بدھ ہی نہیں اسے۔ میں نے کہا نا عورتوں کی لڑائی تھی، زبانی کلامی طعنوں سے بات اس عورت نے آگے بڑھائی، زرسانگہ کو مارنے کے لیے آگے بڑھی تو اس نے اپنے بچاؤ کے لیے اسے دھکا دے دیا۔ غلطی سے آگے یہ جا پڑی۔ وہ بے چاری تو خود دہشت اور خوف کے مارے بیمار ہوگئی ہے۔" انہوں نے جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ بات بنائی۔ باچا جان کی آنکھوں میں بے یقینی دیکھ کے میں نے کہا۔

"باچا جان ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میرا یقین کیجیے ان پہ ہاتھ اٹھانا تو دور کی بات میں تو ان کا اٹھا ہاتھ روکنے کی جسارت بھی نہیں کر پائی۔ سارا گھر گواہ ہے انہوں نے..... میرے ساتھ....." میں سسک اٹھی۔

Urdu.com
URDU PHOTO

"مجھے طمانچے، لاتیں، گھونسے مارے، گالیاں بددعائیں دیں۔ گندے الزامات لگائے، جلتی لکڑی میرے چہرے پہ رکھ دی۔ میں سچ کہہ رہی ہوں باچا جان میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے اللہ رسول کی قسم، میرا کوئی قصور نہیں۔"

"تو کیا اور تیری قسم کیا۔ جب اللہ رسولؐ پہ تیرا ایمان ہی نہیں تو قسم کیوں اٹھاتی ہے۔ تو تو قسم اٹھا کسی بت کی، کسی سانپ کی، سورج کی، جن چیزوں کو پوجتے ہو تم کافر لوگ۔" بی بی جان کے اس طعنے پہ فیروز لالہ بپھر گیا۔

"باچا جان، یہ آخری حد ہے، آپ خود اندازہ لگالیں اس گھر میں اس کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہوگا۔ یہاں نہ اس کے کردار کا احترام کیا جاتا ہے نہ ایمان کا۔ جب میں نے اسے رخصت کیا تھا تو آپ سے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ آپ کے گھر میں اس کا پرانا حوالہ کوئی یاد نہیں رکھے گا۔ یہ وردگ حویلی سے رخصت ہو رہی ہے، وردگ خاندان سے خٹک خاندان تک جاری ہے میں نے اپنا نام اس کے نام کے آگے لگا کے اسے آپ کے حوالے کیا تھا۔ بی بی جان نے اسے نہیں مجھے گالی دی ہے میرے خاندان کو دی ہے۔"

"خاندان خون سے ہوتا ہے، نسب سے ہوتا ہے فیروز تم بھی پٹھان ہو، ہم بھی پٹھان ہیں۔ یہ بات تو جانتے ہو گے نسلیں اپنا خون سینچتی ہیں تو نام کے آگے کوئی حوالہ لگتا ہے۔ میں ان رشتوں کو نہیں مانتی۔ زبانی کلامی کہہ دینے سے کوئی بہن ہو جاتی ہے نہ بھائی بن جاتا ہے۔"

"بی بی جان میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ باچا جان سے اجازت لینے آیا ہوں کہ مومنہ کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اب زریاب آئے گا تو ہی کوئی فیصلہ ہوگا۔"

ابھی باچا جان کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ بی بی جان کہہ اٹھیں

"یہ کہیں نہیں جائے گی۔"

"کیوں نہیں جائے گی۔ اس کی حالت دیکھیں۔ یہ کمزور ہے، بیمار ہے، زخمی ہے۔ اسے کس کے سہارے چھوڑ کے جاؤں میں۔ آخر آپ کی بیٹی بھی تو کافی عرصے سے یہاں رہ رہی ہے۔"

"یہ اس کے باپ کا گھر ہے۔"

"مومنہ بھی اپنے بھائی کے گھر جا رہی ہے"

"وہ اپنے شوہر کے ساتھ، اس کی اجازت سے یہاں آئی ہے۔"

"میں بھی باچا جان سے اجازت ہی طلب کر رہا ہوں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں مومنہ سے یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ زریاب کے

آنے میں چند ہی دن رہ گئے ہیں۔ بلکہ میں اسے جلد از جلد بلوانے کی کوشش کروں گا۔ بہتر ہوگا کہ تم یہیں رک کے اس کا انتظار کرو۔" میں تذبذب کا شکار تھی میری ہچکچاہٹ دیکھ کے بی بی جان نے پینترا بدلا۔

"شوہر کی غیر موجودگی میں قدم باہر دھرنے والی عورتیں بااعتماد نہیں ہوتیں۔ پھر بھی اگر جانا چاہو تو یاد رکھو بچی میں تمہیں نہیں لے جانے دوں گی۔ تم پہ تمہارے اس نام نہاد بھائی کا اختیار چل سکتا ہوگا۔ خٹک خاندان کی بیٹی پہ وہ کوئی حق نہیں جما سکتا۔" بی بی جان کا خیال ہوگا بچی کے بغیر میں جانے کا فیصلہ نہیں کر پاؤں گی، اور شاید ایسا ہی کرتی میں، لیکن فیروز لالہ نے اصرار کیا۔

"مومنہ میری بات مان لو یہاں تمہاری عزت اور جان دونوں غیر محفوظ ہیں۔ تمہیں اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے زندہ رہنا ہے، ورنہ سچ کو دبانے کے لیے یہ لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔" اس تبصرے پہ اب تک تحمل سے بیٹھے باچا جان بھی بھڑک اٹھے۔

"فیروز خان تم بے ادبی کے مرتکب ہو رہے ہو،" میں اور بھی خوفزدہ ہوگئی۔

"ہمت کرو مومنہ، بچی ان کا اپنا خون ہے اسے یہاں کوئی خطرہ نہیں اگر یہ رکھنا چاہتے ہیں تو رکھنے دو چند دن کی بات ہے۔ زریاب سے رابطہ کر کے میں اسے فوراً واپس بلاتا ہوں۔ میرے گھر پہ ہی ساری بات ہوگی۔ تم تیاری کرو۔ یہاں رہو گی تو یا تو پاگل ہو جاؤ گی یا مار دی جاؤ گی۔" میں نے اک نظر باچا جان اور بی بی جان کے جلالی چہرے دیکھے میرے رخسار سے ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ میں نے فیروز لالہ کو دیکھ کے اثبات میں سر ہلایا اپنے چند جوڑے کپڑے اٹھائے اور مقدس کو پیار کر کے باچا جان کے پاس رخصت ہونے آئی۔ دونوں نے منہ پھیر لیا۔

"تمہیں عزت کی بڑی خواہش ہے اور خود تم اس گھر کی عزت روند کے جا رہی ہو۔ اس شخص کے ساتھ جو تمہارے ساس سسر دونوں کی بے عزتی کر گیا تمہارے سامنے اور یاد رکھو تم اس گھر سے بغیر کسی کی رضامندی کے جا رہی ہو۔ نتائج کی ذمہ دار بھی تم ہی ہوگی۔" باچا جان نے سرد لہجے میں کہا اور میں..... میں چلی گئی۔

مومنہ خاموش ہوگئی تھی لیکن مقدس کو ایک ننھی سی بچی کے رونے کی آوازیں اب تک آ رہی تھیں۔

☆☆☆

"بی بی جان میں شکستہ ہو چکا ہوں کچھ تاب لانے کی مجھ میں مزید ہمت نہیں نہ ہی دل اب اور کوئی گھاؤ سہہ سکتا ہے۔ مجھے مزید مت الجھائیں۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔

urdu.com
URDU PHOTO

جو کہنا ہے صاف صاف کہیں۔"

زریاب نے بے بسی کی آخری انتہا پہ پہنچ کے بی بی جان کے گھٹنے تھام کے فریاد کی جو باچا جان کی ملتجی نگاہوں سے ہار مان کے عرصے سے سینے میں دبا راز کھولنے پہ آمادہ تھیں۔ انہوں نے زریاب کے ہاتھ اپنے پہلو سے اٹھائے، لبوں سے لگا کے کہنے لگیں۔

"زریاب مجھے معاف کر دینا۔ میں خان جی کے سامنے، اپنے بیٹوں کے سامنے تم سے معافی مانگتی ہوں اور یہ اعتراف کرتی ہوں کہ ممتا کی کسوٹی پہ میں کھری نہ اتر سکی۔ ایک کمزور لمحے نے مجھے سگے اور سوتیلے رشتوں میں ڈنڈی مارنے پہ اُکسا دیا۔ میری ذرا سی لغزش نے کئی زندگیاں برباد کر دیں۔ مجھے معاف کر دو میں تمہاری گناہ گار ہوں۔"

"بی بی..... جان!" وہ بے یقینی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جھنجھلاہٹ اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔

"میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔ خدارا مجھے پوری بات سنائیں۔ کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟ کن کمزور لمحوں کی بات کر رہی ہیں؟"

"یہ لمحے میری بیٹی زرسانگہ کی زندگی سے میری زندگی تک نقب لگا کے چلے آئے تھے۔ تم جانتے ہی ہو تمہاری بہن کی وجہ سے میں کتنی پریشان رہتی تھی۔ تیس سال سے اوپر ہونے کے بعد بھی اس کی شادی نہ ہو پا رہی تھی۔ شکل و صورت بھی اس کی واجبی تھی اور تعلیم بھی برائے نام تھی۔ اگرچہ خٹک خاندان کی بیٹی کے لیے اس کے خاندان کا نام بھی بہت ہوتا ہے، صورت وغیرہ تو بعد کی باتیں ہیں لیکن اس کی قسمت کہ خاندان میں اس کے جوڑ کا کوئی مرد نہ تھا۔ اور خاندان سے باہر لڑکیاں بیاہنے کا ہمارا رواج نہیں تھا۔ ایسے میں بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ تنہائی، محرومی اور مایوسی نے اسے کس [illegible]

تمہیں یاد ہی ہوگا۔ خان جی نے مجھ سے اپنی بہن پہ دباؤ ڈالنے کے لیے کہا جس کا بیٹا رحیم گل ہماری زر سے پندرہ سال چھوٹا تھا۔ مجھے کچھ تامل تھا لیکن خان جی کے پیہم اصرار پہ میں بہن سے فریاد کر بیٹھی۔ میری محبت میں اس نے کسی طرح بیٹے کو منا ہی لیا یوں بھی سترہ اٹھارہ سالہ لڑکا ابھی اتنا خود سر کہاں ہوا تھا کہ احتجاج کر پاتا ماں باپ کے سامنے۔ لیکن اپنی ساری تلخی اس نے بیوی پہ نکالنا شروع کر دی۔

زرسانگہ کوئی کم عمر الھڑ تو نہیں تھی کہ شوہر سے دب جاتی پھر شوہر بھی وہ جسے چند سال پہلے تک وہ گود میں کھلاتی رہی ہو۔ اس نے بھی رحیم گل سے الجھنا شروع کر دیا۔ اگرچہ یہ ہماری برادری کا پہلا واقعہ نہیں تھا اس سے پہلے بھی کئی بے جوڑ رشتے ہو چکے تھے اور برے

بھلے نبھ بھی چکے تھے لیکن اب وقت بدل رہا تھا۔ تعلیم اور شعور نے ذہن تبدیل کر دیا تھا۔ نہ تو رحیم گل کرخت مزاج پکی عمر کی بیوی کو دلہن تسلیم کر سکا نہ ہی زرسانگہ کے خوابوں کو تعبیر ملی اکھڑے اکھڑے رہنے والے کم عمر شوہر سے، رحیم گل کے ساتھ نے اس کی رہی سہی خود اعتمادی بھی چھین لی۔ وہ احساس کمتری کا شکار ہو گئی اور ستم یہ کہ رحیم گل کا رویہ اس کے احساس کمتری کو دیوانگی میں بدلنے میں مددگار ثابت ہونے لگا۔ وہ اس کے سنگھار پہ تنقید کرتا، اس کی عمر اور شکل پہ بے رحمانہ تبصرے کرتا، اپنی مظلومیت کا رونا روتا اور اس کی کم علمی اور بدزبانی کو کوستا۔ زرسانگہ ہمیشہ یہ سب مجھ سے بیان کرتے ہوئے بلک پڑتی۔

"بی بی جان! باچا جان نے کیوں زبردستی مجھے اس کے سر منڈھا۔ میں ان چاہی ہستی کی طرح اس کے اوپر مسلط نہیں رہنا چاہتی۔ لوگ اسے ترحم آمیز نظروں سے دیکھتے ہیں اور مجھے ایسے جیسے میں کوئی جادوگرنی ہوں جس نے ایک شہزادے کو اپنی قید میں کر رکھا ہے۔

بی بی جان! مجھے محروم ہی رہنا تھا تو خٹک ہاؤس کے ہی کسی کونے میں رکھ دیتے۔ غیروں کے حوالے کرنے کی کیا ضرورت تھی اور وہ بھی اتنا گر کے، خالہ جی اب اٹھتے بیٹھتے جتاتی ہیں کہ بہن کے بہکاوے میں آ کے بیٹا ناقدروں میں رول دیا۔ ان کی بیٹیاں ماں کو سناتی ہیں کہ ہمدردی اور ترس کے نام پہ اکلوتے بیٹے کے لیے اماں اٹھا لائی ہو۔"

"صبر کرو زرے صبر۔" میں اور کیا کہتی۔ "وقت کے ساتھ ساتھ سب صحیح ہو جائے گا۔" "نہیں بی بی جان آنے والا وقت اور بھی تباہی لانے والا ہے۔ ابھی رحیم گل کم عمر ہے اس کے زیر اثر ہے، پڑھ رہا ہے وقت کے ساتھ ملنے والے اختیارات اسے خود مختار بنا دیں گے ابھی وہ مجبوری کے ساتھ مجھ سے نباہ رہا ہے۔ کل کو شاید۔"

"اچھا بول منہ سے نکال زرے۔ تو ماں بننے والی ہے اچھی باتیں سوچا کر۔ آنے والی اولاد تیری قسمت کھول دے گی۔" لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ اولاد اس کی قسمت میں اور اندھیرے لکھ لائے گی، شنا اور جن دنوں پیدا ہونے والی تھی، زرے یہیں تھی۔

تبھی تم مومنہ کو بیاہ لائے۔ یہ واقعہ اس کی ازدواجی زندگی میں نئی تلخی گھول گیا۔ رحیم گل تمہیں اتنی آزادی کے ساتھ من چاہی بیوی ملنے پر رشک و حسد کا شکار ہو گیا۔ اس کا نشانہ بیچاری زرسانگہ ہی ہوتی۔

"من مانیاں کرنا تم لوگوں کا پیدائشی حق ہے، ہے ناں؟ بیٹی کو خود سے آدھی عمر کا خوب صورت لڑکا چاہیے تھا، ماں بھیک مانگ کے لے آئی۔ بیٹے کو جنگلی پھول پسند آیا۔ باپ میلوں چل کے توڑ لایا اور کچھ لوگ مجھ جیسے بدقسمت ہوتے ہیں۔ جن کی ڈور سدا

urdu point
URDU POINT

دوسروں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔"

"لالہ کی شادی کا ذکر کیوں بار بار کرتے ہیں آپ؟ اگر انہوں نے پسند کی شادی کی ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟"

"اور میرا قصور کیا تھا جسے اطاعت اور فرماں برداری کے سبق سکھائے گئے۔ جب میری ماں نے کہا کہ رحیم گل کو اس رشتے پہ اعتراض ہے تو تمہارے والدین نے میرے گھر آ کے میرے ماں باپ کو پٹی پڑھائی کہ بیٹے کی مرضی کیا چیز ہے۔ اصل بات خاندانی ناموس کی ہے۔ خاندان کے بیٹے ہی خاندان کی عزت نہیں ڈھانپیں گے تو کیا باہر سے لوگ آئیں گے مجھے ہر طرح سے مجبور کر کے قربانی کا بکرا بنا دیا گیا۔ زریاب کو کھلی چھٹی کس نے دی؟ تمہارے باپ نے ہی۔ اب کیوں برادری کی کوئی ڈھلتی عمر کی کنواری نظر نہ آئی؟" اس کے یہ طعنے روز کا معمول بن گئے۔ زرے آخری دنوں سے تھی۔ اس حالت میں عورت ویسے ہی زود رنج اور حساس ہوتی ہے۔ رحیم گل نے اسے جلا جلا کے اور بھی ادھ موا کر دیا تھا۔ وہ سنگ باری کر کے چلا جاتا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مومنہ پہ توجہ کرنے پہ مجبور ہو جاتی۔ تمہاری محبت نے اس پہ سچی سہاگنوں والا روپ چڑھایا تھا۔ اس کے جھل مل کرتے چہرے اور قل قل کرتی ہنسی نے دوسرے دن پہ رحیم گل کے گئی۔ وہ تم دونوں کو دیکھ کے کلسنے لگتی۔ تمہارے قہقہے اسے اپنے نوحوں پہ ہنستے معلوم ہوتے۔ اپنی ناخوشگوار اور غیر متوازن زندگی کا قلق اسے رہتا تھا۔

ایسی ہی عجیب ذہنی و جذباتی کیفیت میں اس نے شاور کو جنم دیا۔ کمزوری صحت کی وجہ سے اس کا چڑچڑا پن عروج پہ پہنچ گیا۔ کسی کی ذرا سی بات بھی اسے مشتعل کر دیتی۔ رحیم گل ہر ہفتے آتا اس کی حالت میں مزید ابتری پیدا کر کے چلا جاتا اور وہ اپنی بے بسی کا اظہار بچی اور ملازماؤں پہ نکالا کرتی۔ رفتہ رفتہ مومنہ بھی اس کا نشانہ بننے لگی، پھر مقدس کے بعد جب تم کاروباری دورے پہ گئے تو ایک بار پھر رحیم گل آیا۔ اسے اس کی ماں نے زر سانگہ کو لانے کے لیے بھیجا تھا۔ بیوی کی حالت دیکھ کے وہ اور چڑ گیا حالانکہ یہ حالت سراسر اس کی دین تھی۔ زچگی کے بعد افسردگی اور زندگی سے بیزاری نے اسے صحت کی جانب لوٹنے ہی نہ دیا تھا۔ اندر ہی اندر کڑھ کڑھ کے اس کا سارا خون جل گیا تھا۔ چہرے پہ جھائیاں پڑ چکی تھیں، آنکھیں زرد اور ہاتھ پیر بے جان۔

"اس لاش کو لانے بھیجا ہے ماں نے ساری عورتیں ہی اولاد پیدا کرتی ہیں۔ تم نے نرالی تو نہیں کی جو چھ مہینے سے بستر سنبھالے پڑی ہو۔ اولاد کے بعد تو عورت کے چہرے

پہ نور آ جاتا ہے، تمہارے چہرے کی تو رہی سہی رونق بھی غائب ہو گئی ہے۔ اپنی بھاوج کو دیکھو۔ گلاب کھل رہے ہیں چہرے پہ۔"

"تو جاؤ سونگھ لو، وہ تو جنگلی پھول ہے ناں بقول تمہارے۔ جنگلی سوغاتیں سب کے لیے ہوتی ہیں تم بھی مزا لے لو۔"

"شٹ اپ بدتمیز عورت کچھ تو لحاظ کرو تمہارے چھوٹے بھائی کی بیوی ہے وہ۔"

"تم کیوں نہیں رشتوں کا لحاظ کرتے جب اس کے حسن کے قصیدے پڑھتے ہو۔"

"کون سا قصیدہ پڑھا ہے میں نے! تم تو مفت میں بدنام کرنے والی عورت ہو، تمہارے سائے سے بھی دور رہنا چاہیے۔ منحوس بڑھیا۔" وہ زہر تھوک کے چلا گیا اور وہ ساری رات ان کڑوے الفاظ کی مار سہتی رہی لیکن کمزور اعصاب کی عورت اتنا سب سہہ نہ سکی جب اس کے اندر لاوا پک کے تیار ہو گیا تو وہ کمرے سے نکلی اسے پتا چلا کہ مہمان خانے میں رحیم کے ساتھ مومنہ بھی موجود ہے تو جیسے آتش فشاں پھٹ گیا۔ اتنے دنوں سے اس کے اندر جمع لاوا اس ایک دم ہی نکل گیا اس نے مومنہ اور اپنے شوہر کے حوالے سے کچھ ایسی باتیں کہیں کہ وہ بھی غصے سے باہر نکل گیا اور مومنہ بھی ضبط نہ کر سکی اس کے منہ سے جواب سن کر زر سانگہ بالکل ہی دیوانی ہو گئی اس نے..... اس نے تمہاری بیوی پہ ہاتھ اٹھایا۔ میں نے، حکیمہ نے، سرحدی نے سب نے اسے قابو کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ جیسے کوئی جن اس پہ قابض ہو گیا تھا اتنی طاقت اس کے اندر بھر گئی تھی۔ عجیب سی وحشت اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی، میں خوفزدہ ہو گئی وہ بار بار خود کو چھڑا لیتی اور مومنہ پہ پل پڑتی، ہاتھوں، پیروں کے بے دریغ استعمال کے ساتھ اور پھر..... میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آتش دان سے لکڑی نکالی اور مومنہ کا..... مومنہ کا چہرہ داغ دیا۔"

زریاب دم بخود بیٹھا رہ گیا۔ دراب اور افراسیاب کے چہروں پہ بھی استعجاب تھا جب کہ بی بی جان نے ایک بار بھی نہ نظر اٹھائی نہ چہرہ۔ ان کے جھکے چہرے سے آنسو ٹپک ٹپک کے گود میں رکھے ہاتھوں پہ پڑنے لگے۔

زریاب کے تصور میں مومنہ کا بے داغ ہنستا ہوا چہرے آیا اور شعلے..... اس نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔

"میں مانتی ہوں مجھے صورت حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے مومنہ کی دلجوئی کرنا چاہیے تھی اگر میں اس وقت اسے سنبھال لیتی تو شاید حالات اتنے خراب نہ

UrduPhoto.com
Saba

ہوتے لیکن زرسانگہ کی کیفیت نے میرے ہاتھ پاؤں پھلا دیے۔ وہ بے ہوش ہوگئی تھی اور ڈاکٹر کے مطابق اگر یہ کچھ دیر اور ہوش میں رہتی تو اس کی دماغ کی شریان کا پھٹنا یقینی تھا۔ دوسری طرف غم و غصے اور بے بسی کا شکار مومنہ نے میری لاعلمی میں فیروز کو مدد کے لیے طلب کرلیا۔ خان جی اب تک سارے قصے سے انجان تھے۔ لیکن اب ان کے ساتھ ساتھ سارے گھر کو علم ہونے والا تھا کہ زرسانگہ سے کیا حرکت سرزد ہوئی ہے۔ جب اسے ہوش آنے پہ علم ہوا کہ فیروز مومنہ کے ساتھ خان جی کے کمرے میں ہے اور زریاب کو بلوانے کا فیصلہ ہو رہا ہے تو وہ سراسیمہ ہوگئی۔ میرے پیر پکڑ کے منت کرنے لگی۔

"بی بی جان زریاب کو کچھ پتا نہ چلے۔ وہ پاگل ہو جائے گا اپنی بیوی کا چہرہ دیکھ کے وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

"اسے تو پتا چل ہی جائے گا زرے۔ مومنہ کا چہرہ خود بتائے گا۔ یہ تو نے کیا کیا بدنصیب۔" میں نہ چاہتے ہوئے بھی اسے کوسنے پہ مجبور ہوئی۔

"رحیم گل پہلے ہی مجھے بسانا نہیں چاہتا۔ اب مجھ پہ پاگل پن کا الزام لگا کے مجھے رسوا کردے گا بھائی کی نظروں سے بھی گرے گی میں کہاں جاؤں گی۔ میں تو ہر طرف سے بے وقعت ہو جاؤں گی بی بی جان۔" وہ بلک بلک کے رو رہی تھی۔

"یہ تو پہلے سوچنا تھا۔ اب کیا ہوسکتا ہے۔ بات میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی جب تو آگ اٹھا کے اس پہ پٹکی تھی۔ زریاب کی چہیتی کا منہ جلا دیا تو نے..... وہ تو اک پل یہاں نہ رکے گا اب۔"

"کچھ کرو بی بی جان، کچھ کرو زریاب کے آنے سے پہلے پہلے کچھ ایسا کرو کہ میں بچ جاؤں، دنیا مجھے جینے نہیں دے گی۔ میرا کوئی ٹھکانہ نہ رہے گا۔ سسرال والے پاگل کہہ کے ٹھکرائیں گے تو بھائی بھی نفرت کریں گے۔ مجھے بچالو..... زریاب کو یہ نہ جلنے دو۔ مومنہ کے پاؤں پکڑ کے منت کرلوں گی میں، اسے کسی طرح جانے سے روک دو میں اس سے معافی کی بھیک مانگوں گی، کہوں گی میرا نام وہ مت لے۔"

"اور اگر وہ نہ مانی تو؟"

"تو..... تو پھر میں اسے مار دوں گی..... جب میں اس کا چہرہ جلا سکتی ہوں تو پورے کا پورا بھی بھسم کرسکتی ہوں۔ وہ نہ رہے گی تو کون بتائے گا زریاب کو، کیسے پتا چلے گا رحیم گل کو۔" اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھر چڑھ گئیں اور ہاتھ پیر مڑنے لگے۔ گردن کو خفیف سے جھٹکے لگنے شروع ہوگئے۔

میں ہار گئی..... ممتا کے ہاتھوں..... ساری عمر پلڑا سلامت رکھا..... ایک لمحہ ایسا نہ آیا اتنے سالوں میں کہ تم میں اور افراسیاب میں دراب اور زرسانگہ کے مقابلے فرق برتا ہو لیکن اس وقت..... لیکن نہیں..... شاید زرے کے بجائے میری کوئی اور بھی اولاد ہوتی تو میں یہی کرتی..... چاہے تم ہوتے چاہے دراب..... جب کسی ایک اولاد کی جان پہ بن آئے تو ماں سب کر گزرتی ہے میں نے سوچا تمہاری شادی شدہ زندگی میری بیٹی کی جان سے قیمتی تو نہیں ہوگی۔ بیٹا سلامت تو بہوئیں اور مل جائیں گی اپنی لاڈلی کہاں سے لاؤں گی۔ میں کیا جانتی تھی میں تو سب کچھ گنوانے جا رہی تھی سب کچھ۔

میری ہر کوشش کے باوجود فیروز مومنہ کو لے گیا خان جی مومنہ کے ساتھ ہونے والے سلوک سے ناخوش تھے لیکن فیروز کے اشتعال انگیز جملے انہیں بھی ناگوار گزرے میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کے انہیں اور ورغلایا اور ایک منصوبہ تیار کرلیا۔ میں جانتی تھی فیروز کے بلانے پہ زریاب فوراً چلا آئے گا۔ اور پھر۔ مومنہ کی زبانی سب کچھ سن کر..... یہی تو میں نہیں چاہتی تھی بیٹی کے ساتھ ساتھ مجھے بیٹا بھی ہاتھ سے جاتا دکھائی دے رہا تھا میں نے زریاب کو خان جی کی بیماری کی اطلاع دے کر فوراً آنے کو کہا۔ میرا پیغام جب اسے ملا تب تک تو فیروز اپنے گھر بھی نہ پہنچا ہوگا۔ زریاب اطلاع ملتے ہی وہاں سے روانہ ہوگیا اس طرح فیروز سے اس کا رابطہ نہ ہوسکا۔ تیسرے دن جب....." بی بی جان نے کہتے کہتے سر اٹھایا، کمرے میں موجود تمام نفوس پہ ایک نظر ڈالی، پھر ان کی نگاہیں گم صم بیٹھے زریاب پہ جم گئیں۔

"تیسرے دن تم..... تم آئے تو میں حواس باختہ ہوگئی۔ خان جی کا غصہ کم ہو چکا تھا۔ وہ میری چال میں شریک ہونے سے انکاری تھے بلکہ انہوں نے مجھے سختی سے باز رہنے کا حکم دیا لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا میں نے اپنی عمر بھر کی وفاؤں اور خدمتوں کے بدلے ان سے یہ گستاخی کا حق مانگ لیا انہیں اللہ اور رسولؐ کے واسطے دیے، اولاد کی قسمیں دے کر مجبور کردیا۔ وہ چپ کر گئے اور میں نے تمہیں....."

ان کی آواز لڑکھڑائی تو زریاب نے ہاتھ کھڑا کر کے انہیں خاموش رہنے کی استدعا کی۔ وہ جانتا تھا آگے کیا ہوا۔ بوجھل قدموں کے ساتھ وہ دائیں طرف موجود بڑی سی کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔

شفق کی لالی حدِ نگاہ تک خون کی لکیر کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے کانوں میں بی بی جان کے سالوں پہلے کہے بے رحم الفاظ کی بازگشت سنائی دی۔

UrduPhoto.com
Saba

"میں نہ کہتی تھی زریاب، نسب کے بغیر اصول کچھ نہیں ہوتا۔ جنگل کے پھول جنگلوں میں ہی رہ پاتے ہیں۔ تمہاری وہ بیوی چار دن تمہارے بغیر نہ رہ سکی۔ تمہارے جاتے ہی وہ تمہارا دوست فیروز جو خود کو اس کا بھائی بتاتا ہے، توبہ توبہ کیسے کیسے رشتوں کو پامال کرتے ہیں یہ بے ہدایتے لوگ، وہ روز ہی آجاتا تھا ملنے، اس سے پہلے مجھے اعتراض نہ ہوا پھر لوگ باتیں بنانے لگے آخر کون سا سگا والا بھائی تھا۔ گھنٹوں کمرے میں بند رہتے تھے۔ میں نے صاف الفاظ میں ٹوکا تو وہ تو کھل کے ہی سامنے آ گئی۔ بے شرمی سے اپنے اور اس کے تعلقات کو تسلیم کرتے ہوئے کہنے لگی میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی، تمہیں اپنا بیٹا مبارک ہو جس نے مجھے یہاں قید کر کے رکھا ہوا ہے۔ میں فیروز کے ساتھ جا رہی ہوں۔ میری تمام تر خوشیاں اسی کے پاس ہیں نامراد بچی تک چھوڑ گئی۔" وہ چیخ اٹھا تھا۔

"بس کریں بی بی جان، آپ جانتی ہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں، کس کے متعلق کہہ رہی ہیں اور کس سے کہہ رہی ہیں۔" اس وقت طیش کے مارے اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ اپنا سر سامنے کی دیوار سے پھوڑ ڈالے، کیونکہ یہ بدترین بات کہنے والی اس کی معزز ترین بی بی جان تھیں جن سے بے ادبی کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن اس قدر فضول باتیں۔

"پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے زریاب تمہیں یقین نہیں تو اپنے باپ سے پوچھو، میں تو ساس ہوں ناں اس کی اور تمہاری سوتیلی ماں۔ جھوٹ بھی کہہ سکتی ہوں، اس گھر کے ہر فرد سے پوچھ لو۔ کس بے شرمی اور بے غیرتی کا مظاہرہ کر کے گئی ہیں تمہارا دوست اور تمہاری بیوی۔ دیکھو خان جی کی حالت اور جا کے دیکھو زرسانگہ کو۔ کیسے بے سدھ پڑی ہے۔ یہ تماشا بھی تو نیا ہی تھا اس گھر کے در و دیوار کے لیے۔ میں تو کہتی ہوں میں زندہ ہی کیوں ہوں یہ سب دیکھنے کے بعد شاید تمہاری آنکھوں میں بے اعتباری کے رنگ دیکھنا باقی تھے یا شاید تم سے جھوٹا ہونے کا الزام سننا باقی تھا۔"

"بے حیا میرے سامنے ہی کتنا گند بک گئی۔ کہنے لگی زریاب جیسے شخص مرد کے ساتھ کوئی عورت چار دن بھی خوش رہ لے تو بڑی بات ہے۔ ہر وقت رنگوں میں گم رہنے والا دیوانہ۔ میں تو فیروز جیسے مرد کے پیچھے مرتی ہوں جسے مرد کہنے میں بھی مزا آتا ہے۔"

بی بی جان کا یہ جملہ زریاب کو بھڑکا دینے کے لیے کافی تھا۔

"موم..... نہ....." وہ چیخا۔

"میں چھوڑوں گا نہیں اس ذلیل عورت کو نہ ہی اس بے غیرت شخص کو..... میری آنکھوں میں دھول جھونکی دونوں نے۔" غیرت و غصے سے وہ کپکپانے لگا۔

"دفع کرو مردودوں کو۔ تین حرف بھیج اس کافرن پہ، جانے دے جہاں مرضی خوار ہوتی پھرے۔ اس کی منزل یہ گھر تھا ہی نہیں شکر ہے تمہاری بچی محفوظ رہی ہے۔"

"ایسے کیسے دفع کر دوں..... وہ میری مردانگی کو گالی دے گئی ہے، فیروز میری دوستی کا خون کر گیا ہے۔ میں بے غیرتوں کی طرح بیٹھ جاؤں..... نہیں بی بی جان..... میں ان دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" وہ دیوار سے لٹکی رائفل اٹھا کے باہر لپکا۔

"زریاب..... رک جاؤ۔" وہ پکاریں باجا جان اٹھتے اٹھتے گر پڑے۔ اچانک ہی فالج نے ان پہ حملہ کر دیا۔ حضرتی بی نے ایک نظر شوہر کے اینٹھے ہوئے وجود پہ ڈالی دوسری نظر طوفان کی طرح باہر نکلتے کڑیل بیٹے پہ ڈالی۔ پہلی بار انہیں اپنے فیصلے کی سنگینی کا احساس ہوا۔

☆☆☆

ہر ویلے تانگاں یار دیاں
ہیں ناں بیٹھی کاگ اڈاواں

وہ دو دن قیامت کے دن تھے۔ کہتے ہیں ناں روز حشر کسی کو کسی کا ہوش نہیں ہوگا۔ وہی حال میرا تھا ان دنوں، فرق صرف یہ تھا کہ مجھے اپنا ہوش نہ تھا..... میری سانسیں اُبھرتی تھیں، ڈوبتی تھیں اور ہر سانس کے ساتھ تسبیح کے دانے کی طرح ایک نام سینے میں گرتا جاتا تھا۔

زریاب.....

میں پاگلوں، دیوانوں کی طرح حویلی کے دروازے تک دن میں کئی چکر لگایا کرتی۔ ہر آہٹ مجھے اس کے آنے کی خبر دیتی اور اسے نہ پا کے مارے جھنجھلاہٹ کے میں شریر

ہواؤں سے لڑ پڑتی آپ نجھاں کہ میں قاصد وجھاں
میرا کھی گیا حال نماناں

فیروز لالہ سے جرح کر کر کے میں نے زچ کر ڈالا۔

مجھے یقین نہ آتا کہ وہ زریاب سے رابطہ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ مجھے لگتا جیسے مجھ سے کچھ چھپایا جا رہا ہے۔

"کہیں زریاب نے آنے سے انکار تو نہیں کر دیا، کہیں میرا بغیر اجازت گھر سے نکلنا اسے ناراض تو نہیں کر گیا، کہیں بی بی جان نے اسے بھی تو یہ کہہ کر نہیں ورغلایا کہ زرسانگہ سے جھگڑا بڑھانے میں ساری غلطی میری ہے۔"

میری ہر سوچ کی تان انہی خدشوں پہ آ کے ٹوٹ جاتی۔ اس کی ناراضگی کا ہلکا سا

urdu.com
Sahar URDU PHOTO

اندیشہ بھی مجھے بے جان کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں آس ہار کے بے دم ہونے لگتی تو کانوں کے پاس کسی کی سرگوشی میرا پھر سے حوصلہ بڑھا دیتی۔

غلام فرید میں تاں دوزخ سڑساں
جے میں مکھ ماہی ولوں موڑاں

میں ہر خدشے جھٹک دیتی۔

"نہیں نہیں میرا زریاب مجھ سے منہ نہیں موڑ سکتا، وہ مجھ سے خفا نہیں ہو سکتا..... اس میں اتنا حوصلہ ہی کہاں ہے..... پھر..... پھر.....؟ پھر وہ آیا کیوں نہیں اب تک؟ میرے ساتھ اتنا کچھ ہو گیا وہ کیسے انجان ہے؟ کیا اسے کسی سے اطلاع ملنے کی ضرورت ہے؟ وہ تو کہتا ہے..... مومنہ تجھے پیاس لگتی ہے تو مجھے پتا چل جاتا ہے..... میں گہری نیند میں محسوس کر لیتا ہوں تو نے کب کروٹ بدلی..... پھر اسے پتا کیسے نہ چلا کہ وہ چہرہ..... جسے دیکھ کے اس کی صبح نکھرتی ہے..... اب داغدار ہو چکا ہے..... سلگ رہا ہے اس کے پیار بھرے مرہم کے لیے ترس رہا ہے..... زریاب..... زریاب..... تم کہاں ہو....."

ہاں میں سچ مچ دیوانی ہو گئی تھی۔

گلی کر کے چھوڑ تو اے
تے بیٹھی لکھ گلیاں دے وچ

مجھے نہ بھوک لگتی..... نہ پیاس محسوس ہوتی۔ اپنی ننھی سی بچی کی ہر حرکت کبھی کبھی لہو بن کے پورے وجود پہ چھا جاتی مگر میں ممتا کو تھپک دیتی۔

"صبر..... بس کچھ دیر اور..... وہ آتا ہی ہوگا..... مجھے انصاف دلانے..... وہی تو ہے جو مجھے سب سے زیادہ جانتا ہے..... نہ صرف جانتا ہے بلکہ مانتا بھی ہے..... بس وہ آ جائے پھر میں پوری شان سے وہاں لوٹوں گی، اپنے گھر..... اپنی بچی کے پاس..... بس وہ آ جائے اس کے بغیر نہیں..... اس کے بغیر میں کیا ہوں.....؟ کچھ بھی نہیں وہ آئے گا..... میں سر اٹھا کے اس حویلی میں جاؤں گی پھر کس کی مجال ہے جو مجھے ٹیڑھی آنکھ سے بھی دیکھ لے..... لیکن..... وہ آئے تو سہی..... وہ کیوں نہیں آتا.....؟

"خان زریاب آ گئے"

میری آنکھیں پتھرا چکی تھیں رستہ دیکھتے دیکھتے جب کسی نے مجھے یہ اطلاع دی تو میری پلک تک نہ جھپک سکی۔

"آ گیا..... زریاب..... آ گیا۔" میں ننگے پیر اٹھ کے بھاگی۔

"مومنہ..... رکو..... وہ یہیں آئے گا۔" لالی نے پیچھے سے پکار کے مجھے روکنا چاہا۔

"مردانے میں اس وقت نجانے کون کون ہوگا" "رک جاؤ۔"

لیکن میں کیسے رکتی، بخار کی حدت سے تپتے میرے ننگے پاؤں ٹھنڈے پکے فرش پہ جھلس جھلس کے پڑ رہے تھے۔ میرے کئی دن کے بکھرے روکھے بے ترتیب بال اور بھی اُجڑ گئے۔ میرے اس طرح بھاگنے سے بے پروائی سے سر پہ ڈالی چادر بھی نیچے لٹک رہی تھی۔ حجرے کے پاس میرے پاؤں کے انگوٹھے میں چادر کا کونا پھنسا اور میں منہ کے بل دروازے پہ گر گئی، دہلیز پہ ایک اکھڑا ہوا کیل میرے ہونٹ پہ لگا اور دور تک نازک ماس ادھیڑ گیا۔ میں پاؤں سہلاتے ہوئے چادر کا کونا لبوں پہ رکھ کے خون دبا رہی تھی کہ اندر سے زریاب کی آواز آئی۔

"مومنہ کہاں ہے؟ میری بیوی کہاں ہے؟"

مجھے لگا جیسے اسے دیکھے صدیاں بیت گئی ہوں۔ میرے اندر کی اداسی کو اس کی آواز نے اور بھڑکا دیا۔ اٹھنے سے پہلے میں نے درد کی شدتیں دباتے ہوئے بڑے اشتیاق سے ادھ کھلے دروازے سے اندر جھانکنا چاہا اور..... میں دھک سے رہ گئی..... فیروز لالہ کا گریبان زریاب کی گرفت میں تھا اور اس کی رائفل کا رخ لالہ کے سینے کی جانب۔ اس وقت لالہ کے چہرے پہ بھی وہی بے یقینی تھی جس نے ایکا ایکی مجھے جکڑ کے بت کر دیا تھا۔

"میں پوچھ رہا ہوں کہ میری بیوی تمہارے پاس ہے؟"

"ہاں..... وہ اندر....." لالہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی زریاب نے اسے ایک زور کا جھٹکا دیا۔ اس کی آنکھیں جوش سے باہر ابل رہی تھیں وہ مجھے بالکل اجنبی سا محسوس ہو رہا تھا..... ہاں بالکل اجنبی اتنا اجنبی تو وہ مجھے تب بھی نہ لگا تھا جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔

"مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تم اسے زبردستی لائے ہو یا وہ اپنی مرضی سے آئی ہے؟"

"میں کیوں زبردستی کروں گا؟" کچھ نہ سمجھنے کی کیفیت میں بھی لالہ نے تحمل سے کام لینے کی پوری پوری کوشش کی۔

"وہ اپنی خوشی سے، اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئی ہے۔" اس کے اتنا کہتے ہی زریاب آپے سے باہر ہو گیا۔ رائفل کے بٹ کے زور پہ اس نے لالہ کو نیچے گرا دیا۔

"بے غیرت کتے' یہ اعتراف میرے سامنے کرتے ہوئے تجھے ذرا بھی غیرت نہیں آ رہی..... اور کہاں ہے..... کہاں ہے وہ ناگن وہ بے حیا..... بے وفا عورت..... کمینی

Urdu.com
UrduPhoto.com
Saba

نسل کی عورت..... جسے عزت راس نہ آئی..... بلا اسے..... اس کے سامنے میں تیری لاش گراؤں گا..... تیری، جس کے ساتھ وہ اپنی "خوشی" اور "مرضی" سے آئی ہے اور اسے ..... اسے میں یہاں نہیں ماروں گا..... بے وفا ہی سہی ہے تو میری بیوی..... اس کے نام کے آگے میرا نام لگا ہے، اس کی ناپاک لاش میرے ہی گھر میں گرے گی۔ میں اس کا خون بھی کسی غیر زمین پہ بہانا پسند نہیں کرتا..... وہ کیا سمجھتی ہے میرے جیتے جی دوسرا یار ڈھونڈ نکالے گی۔"

"زر..... یاب....." آنکھیں پھاڑ کے اس کے زہر اگلتے لہجے پہ غور کرنے والا فیروز لالہ جیسے کسی خواب سے جاگ کے دھاڑا تھا۔

"زریاب..... ہوش میں رہ کے بات کرو....." وہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ میں اسی طرح سنگی مورتی کی طرح جیسے دہلیز پہ نصب، گرنے اٹھنے کے انداز میں اندر جھانکتی رہی۔ مجھے زریاب کے ہلاکت میں ڈال دینے والے جملے بھی یاد دیے تھے اور فیروز لالہ اور اس کا ایک دوسرے پر جھپٹنا بھی دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن میں کچھ کرنے کے قابل نہ رہی تھی۔ میرے ہونٹوں سے خون ٹپک کے مٹی میں گر رہا تھا اور پتھرائی ہوئی بے یقین آنکھوں سے بے آواز آنسو اس خون کو پتلا کر کے مٹی میں جذب ہو رہے تھے، مجھے لگ رہا تھا جیسے اب کبھی میں ہل سکوں گی نہ ہی بول پاؤں گی۔ اچانک فائر کی آواز نے مجھے ہلا کے رکھ دیا اور میرے اس گمان کو توڑ کے رکھ دیا، لرزتی ٹانگوں پہ اٹھتے ہوئے میں نے آخری بار فیروز لالہ کو خون میں لت پت زمین پہ گرتے دیکھا۔

حجرے کے دوسری طرف سے بہت سے بھاگتے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ شاید فائر کی آواز نے ملازمین کو بھی چونکنے پہ مجبور کر دیا۔ میں نے زمین پہ گری چادر اٹھائی، اپنے گرد لپیٹی اور وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔"

مومنہ خاموش ہو گئی تھی لیکن دروازے کے اس طرف کھڑی مقدس اور دوسری جانب اس کے قریب ہی بیٹھا خوشنود..... دونوں کتنی ہی دیر اس کے دوبارہ بولنے کے منتظر رہے..... لیکن..... مومنہ کے خشک لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے تھے، ننھے ننھے ستارے پروئے ہوئی پلکیں بند ہو گئی تھیں۔ پپوٹوں کی ہلکی سی لرزش اس بت میں جان ظاہر کر رہی تھی۔

"پھر.....؟" خوشنود اگرچہ اس سے پہلے بھی کئی بار اپنے دادا اور تایا سے باپ کی المناک موت کا واقعہ سن چکا تھا لیکن اتنی تفصیل سے سننے کے بعد اور وہ بھی ایسی ہستی کی

زبانی جس نے اسے اپنی آنکھوں سے زندگی سے موت کی جانب جاتے دیکھا تھا، ایک عجیب سی تکان اور اداسی محسوس کر رہا تھا۔ ایک طویل سرد آہ بھرنے کے بعد اس نے کافی دیر سے خاموش ساکت لیٹی مومنہ کو مخاطب کیا۔ اس کی پلکوں میں خفیف سی جنبش پیدا ہوئی۔

"پھر.....؟ پھر بیس سال..... وہ بیس سال صرف میرے تھے ان بیس سالوں میں اور کوئی نہیں..... نہ زریاب..... نہ فیروز لالہ..... نہ مقدس..... نہ کوئی اور..... بس میں ہی میں..... بلکہ شاید میں بھی کہیں نہیں تھی۔ بس یہ بیس سال تھے..... خالی..... تنہا اکیلے..... بیس سال..... ان کا کیا بتاؤں تمہیں..... تم جاننا چاہتے تھے وہ میں نے بتا دیا ہے وہ بھی صرف اس لیے کہ تم نے فیروز خان وردگ کا بیٹا ہونے کا حق استعمال کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا تھا اور اس کے اور لالہ کے مجھ پہ بہت سے قرض ہیں۔" وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگی، خوشنود نے سہارا دے کے اسے بٹھایا۔

"خوشنود..... اب تمہیں یقین آ گیا کہ تمہارا باپ بے موت ضرور مارا گیا لیکن بالکل بے قصور۔ وہ محبتوں کا لٹا ہوا آدمی تھا۔ جہاں جاتا رشتے بنا لیتا یہی رشتے اسے ڈس گئے۔ زریاب نے اس کے جذبوں کو مٹی میں رول دیا۔ اس دن صرف فیروز لالہ نہیں مرا تھا..... خلوص اور مروت کی میت ہوئی تھی، سچائی کا خون ہوا تھا۔ میں بڑی سے بڑی قسم اٹھانے کو تیار ہوں۔ وہ شخص مجھے تو کیا کسی عورت کو غلط نظر سے نہیں دیکھ سکتا تھا مجھے تو ہرگز نہیں۔ اس لیے بھی کہ اس نے مجھے بہن کہا بھی نہیں مانا بھی تھا اور اس لئے بھی کہ میں زریاب کی بیوی تھی، زریاب کی جسے اپنا سب سے قریبی دوست کہتا تھا وہ اور اس زریاب نے ہی.....

میرے سالوں سے مرے ہوئے دل میں اچانک ایک شدید حرکت پیدا ہو جاتی ہے جب مجھے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ نجانے زریاب کی طرح اور کتنے لوگ ہوں گے جو اس کے اور میرے رشتے کو بدگمانی کی نظر سے دیکھتے ہوں گے۔ میرا بس چلے تو اپنی جان دے کے بھی سب کو یقین دلا دوں کہ وہ میرا لالہ تھا میرا بھائی..... صرف اور صرف بھائی۔ تم..... تم تو یقین کرتے ہو ناں میری بات کا۔" اس کے سر ہلانے پر مومنہ نے سکون سے تکیے پر سر ٹکا دیا۔

"تو تمہاری تسلی ہو گئی اب۔"

"لیکن....." دروازے نے بے آواز حرکت کی اور مقدس دو قدم اندر چلی آئی۔ اس کی آواز پہ خوشنود بری طرح چونک کر پیچھے پلٹا۔ مومنہ بھی ایک جھٹکے کے ساتھ ساتھ

UrduPhoto.com
Saba

اٹھ بیٹھی اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں ہلکے نیلے شلوار قمیص اور سفید بڑی سی چادر میں ملبوس اس کم عمری "مومنہ" پہ جمی تھیں جس کے چہرے پہ اتنی ہی تھکان تھی، آنکھوں میں اتنی ہی ویرانی تھی، جتنی کہ اس بستر پر پڑی "مومنہ" کی آنکھوں اور چہرے پہ تھی۔

"لیکن میری تسلی نہیں ہوئی..... میری..... یعنی مقدس زریاب خٹک کی..... بہت سے سوال ہیں جن کے جواب مجھے چاہئیں..... اگر ڈاکٹر خوشنود نے اپنے سوالات کے لیے فیروز علی وردگ کا بیٹا ہونے کا حق استعمال کیا ہے تو میں زریاب خٹک کی بیٹی ہونے کی حیثیت سے آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں زریاب خٹک جو آپ کا شوہر ہے..... اب بھی..... ابھی تک..... آپ..... آپ..... مومنہ علی..... آپ میری ماں ہونے کی حیثیت سے مجھے جواب دہ ہیں۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتی اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بیڈ تک آئی۔ مومنہ ٹکر دیکھتے ہوئے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اگر وہ اپنا تعارف نہ بھی کراتی تو تب بھی اسے سیکنڈ نہ لگتا مقدس کو پہچاننے میں وہی پیشانی..... وہی سنہری رنگت..... ہلکے ابروؤں پہ قطار کے ساتھ بنے وہی بھورے تین تل..... جو اس کے چہرے پر قدرتی تھے..... اور وہی نیلی کانچ سی دھلی دھلی آنکھیں۔

"یوں لگتا ہے جیسے نیلم کے ٹکڑوں کے گرد کسی نے ہیرے پور چور کر کے بکھیر دیے ہوں۔" اس کی پلکوں پہ ٹنگے آنسو دیکھ کے مومنہ کو وہ بات یاد آئی جو زریاب نے اسے پہلی بار روتا دیکھ کے کہی تھی۔ اس نے سالوں سے سمٹے بازو اپنی بیٹی کے لیے پھیلا دیے۔ اس کا دل اچھل اچھل کے پسلیوں تک بجنے لگا اپنی لاڈلی کو چھپا [illegible] لیکن وہ دل خود ہی حیران سا ہو کے رک گیا..... وہ بازو خود ہی پشیمان سے ہو کے خود میں دوبارہ آ گرے جب اس نے مقدس کو کسی جذبے اور احساس کے بغیر وہیں کھڑے خود کو گھورتے پایا۔

"تو تم بھی..... تم بھی ان میں سے ہو جنہیں یقین کرنے کے لیے میری جان کی ضرورت ہے..... آہ..... مجھے خبر نہ تھی کہ میرا اپنا خون بھی مجھے بے اعتبار جانے گا۔"

"میں یقین کر سکتی ہوں بلکہ مجھے یقین ہے ان سب باتوں کی سچائی کا جو آپ نے کہیں لیکن....." اس کے الفاظ پھر سے مومنہ کو زندہ کر گئے۔

"لیکن یہ آدھا سچ ہے۔ سچ کبھی ادھورا نہیں ہوتا۔ سچ کبھی مصلحت پسند نہیں ہوتا۔ سچ کبھی بزدل نہیں ہوتا..... سچ کو روپوشی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ آپ کہہ رہی تھیں ناں

ابھی کہ میرا بس چلے تو اپنی جان دے کر سب کو یقین دلا دوں کہ فیروز اور میرا کیا رشتہ تھا تو پھر..... آپ نے یقین کیوں نہ دلایا۔ آپ کے چہرے پہ ظلم کا یہ نشان گواہ ہوتا آپ کی بے گناہی کا۔ جو جھوٹ میرے باپ کو مشتعل کرنے کا سبب بنا تھا وہ اگر اتنا ہی بے بنیاد اور کھوکھلا تھا تو آپ ایک ہی وار میں اسے مسمار کر سکتی تھیں لیکن آپ نے ایسا نہ کیا..... آپ نے ایسا کرنے کی کوشش ہی نہ کی..... آپ فرار ہو گئیں..... کیوں..... کس لیے؟" وہ پھٹ پڑی۔

"کیونکہ میں جاننے لگی تھی پھولوں کے رنگ کالے کیسے ہوتے ہیں" مومنہ نے سرگوشی کی، ایسی سرگوشی جسے صرف وہ ہی سن پائی تھی۔

"آپ بتاتی کیوں نہیں ایسا کیا تھا جس کو چھپانے کے لیے آپ کو خود چھپنا پڑا۔؟"

"کچھ نہیں۔" وہ ضبط نہ کر سکی اور اتنی نقاہت کے باوجود چیخ اٹھی۔ اس کا بدن لرز رہا تھا اور رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ خوشنود کے اندر کا ڈاکٹر بیدار ہو گیا۔ اس نے فوراً اٹھ کے نرس کو بیل دی اور اتنے عرصے میں پہلی بار مقدس کو مخاطب کیا۔

"مس مقدس..... ہو سکے تو آپ کل تشریف لے آئیے ان کی حالت ایسی ہرگز نہیں کہ یہ کوئی شدید اعصابی اور جذباتی جھٹکا سہہ سکیں۔" اس نے اسے دیکھے بغیر پیشہ وارانہ سی [illegible] دی۔ جسے ان سنی کرتے ہوئے مومنہ ہانپتے ہوئے کہنے لگی۔

"[illegible] کچھ چھپانے کے لیے فرار ہوئی تھی نہ ہی اپنی جان بچانے کے لیے۔ میں اس [illegible] اس کی جھوٹی غیرت کی تسکین نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں..... میں تین دن [illegible] پیاسی صرف اس کے انتظار میں راستے کا پتھر بنی رہی، اس کی راہ تکتی رہی۔ وہ [illegible] کا تڑپتا ہوا آئے گا..... میری حالت دیکھ کے اس کا خون کھول جائے گا..... مجھے ملنے والے ایک ایک زخم کا حساب لے گا وہ..... اور وہ آیا..... مجھے ایک نیا زخم دینے کے لیے۔ میری رہی سہی جان بھی نکالنے کے لیے..... مجھے مان دینے والے واحد شخص کو مجھ سے چھیننے کے لیے..... میں سہہ جاتی؟ بتاؤ میں ایسے ہی سہہ جاتی.....؟ میں کچھ نہ کرتی؟ میں نے بھی وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا..... ایک ہاری ہوئی..... روندی ہوئی ریزہ ریزہ عورت کو کیا کرنا چاہیے تھا..... میں نے..... میں نے۔"

اس کی آواز ڈوبنے لگی۔

"میں نے وہی کیا..... بالکل ٹھیک کیا..... زریاب کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔" وہ نڈھال ہو گئی۔ خوشنود نے بے بسی سے نہ چاہتے ہوئے بھی مقدس کو دیکھا وہ چپ

Pakistanipoint.com
Sahar URDU PHOTO

چاپ الٹے قدموں باہر نکل گئی۔

نرس نے کچھ ہی دیر میں مومنہ کو پرسکون کر دیا۔ آکسیجن کی نالی اور مصنوعی دھڑکنوں کے سہارے وہ غنودگی کے عالم میں تھی۔ اس کا ہاتھ خوشنود کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ اپنی الجھن سمجھنے سے قاصر تھا۔ اسے رہ رہ کے مقدس پہ غصہ آتا جو جاتے جاتے اسے بھی ایک سوال میں الجھا گئی تھی۔

اس عورت کے ایک ایک لفظ پہ ایمان لانے کو جی چاہتا تھا۔ خود اس کی ماں کی گواہی بھی کافی تھی اس لیے ہی تو وہ اتنی اپنائیت اور عقیدت کے ساتھ اسے پھوپھی جان کہتا تھا لیکن..... پھر وہ فرار۔ یہ اس کے گمان سے بھی باہر تھا۔ زریاب پہ اس کا غصہ سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن اولاد تک سے چھپ جانا؟ زریاب کو تو قانون نے سزا دی تھی۔ یہ الگ بات کہ بار بار کی اپیل نے سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا تھا لیکن پھر.....

وہ سر جھٹک کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"فی الحال مجھے ان کے مکمل صحت یاب ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔"

اس نے سوچا حالانکہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ جس قدر خراب حالت میں وہ اسے اٹھا کے اس ہاسپٹل تک لایا تھا، اس کے بعد اس کا نہ صرف زندہ بچ جانا بلکہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ اتنی دیر گفتگو کرنا بھی ایک معجزہ ہی تھا اور اب ایک اور معجزہ ہی ہوگا اگر مومنہ ان مصنوعی سہاروں کے بغیر بھی زندہ رہ لے۔

وہ پوری رات اس نے موت سے لڑتے لڑتے گزاری۔ ہر بار ہوش میں آنے کے بعد اس کے لبوں پہ مقدس کا نام ہوتا اور پھر وہ ڈھے جاتی۔ اس کی ڈوبتی نبضیں اور رکتی دھڑکنیں خوشنود کو فکر مند کر جاتیں لیکن رات گزرتے ہی جیسے [illegible] مانگ لائی۔ شاید وہ خود بھی کسی کے دل میں اپنے لیے بدگمانی اور حد سے چھوڑ [illegible] چاہتی تھی۔

"تم..... تم خوشنود..... تم کیسے جانتے ہو مقدس کو؟" ذرا سنبھلتے ہی اس نے سوال کیا۔ ایسا سوال جس کا اصل جواب دینا شاید خوشنود کے لیے خود کو ہار دینے کے مترادف تھا۔

"بس کچھ ہی دن پہلے اتفاقیہ ملاقات ہوئی تھی لیکن درحقیقت وہ پہلے ہی آپ کی تلاش میں تھیں۔ انہیں کسی نے آپ کے لاہور میں ہونے کی اطلاع دے دی تھی۔ آپ کے ساتھ رہنے والی اماں برکتے تک تو وہ پہنچ ہی چکی تھیں اور ایک دن اماں کو میرے ساتھ دیکھ کے مجھ سے پوچھنے لگیں۔ پتا نہیں کیوں میرا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں کہ ان کا

آپ سے کیا رشتہ ہو سکتا ہے، میں کچھ سوچے سمجھے بغیر آپ کے پاس لے آیا۔ مجھے ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو پہلے آپ سے ذکر کر لیتا۔"

"میں نے کہا بھی تھا کہ کسی کو میرے متعلق پتا نہ چلے اور کیا تمہیں اس کی صورت دیکھ کے بھی کچھ محسوس نہ ہوا۔"

"ہوا تھا..... بہت کچھ محسوس ہوا تھا۔" وہ کھویا کھویا سا سامنے رکھے پھولوں کو بے دھیانی سے تک رہا تھا۔

"تمہیں تو اسے دیکھتے ہی پتا چل جانا چاہیے تھا کہ وہ میری بیٹی ہے۔"

"میں نے کہا ناں....." وہ خود کو بھی بھلا چکا تھا۔

"میں نے کہا ناں میرا دھیان کسی اور طرف گیا ہی نہیں..... اس سے ہٹتا تو کہیں جاتا۔ مجھے کچھ یاد نہ تھا نہ آپ کی ہدایت نہ کچھ اور..... وہ سامنے ہو تو پھر مجھے [illegible]"

"خوشنود۔" مومنہ بے یقینی سے پکار اٹھی۔ اس کی غبار غبار ہوتی آنکھیں چھلک پڑیں اور وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔ خفت سے اس کا گندمی چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ کتنی ہی دیر اسے دیکھتی رہی۔

"خوشنود بس ایک بار اور میری مدد کرو۔ مقدس کو ایک بار میرے سامنے لے آؤ مجھے اسے [illegible] ہے..... اب تو مجھے اس سے سب کچھ کہنا ہی پڑے گا۔ بات صرف میری نہیں [illegible] وہ کہانی جو مجھ سے شروع ہوئی تھی۔ وقت نے اس میں کتنے کردار شامل کر دیے [illegible] اب ہر کردار کا حق پورا کرنا ہے اسے بلاؤ۔"

"[illegible] پھوپھی جان" [illegible] نے اپنی معذوری ظاہر کی۔

"آپ میرے لیے قابلِ احترام سہی لیکن میں کیسے بھولوں کہ وہ خان زریاب خٹک کی بیٹی ہے۔ مجھے اس کے سامنے جانے پہ مجبور مت کریں۔ میں کمزور نہیں پڑنا چاہتا۔"

"وہ صرف تمہارے دشمن کی بیٹی نہیں تمہاری پھوپھی کی بیٹی بھی ہے اور تمہاری پھوپھی ان مہمان سانسوں کے ساتھ اپنی اکلوتی اولاد کو دیکھنے کی خواہش کر رہی ہیں۔ کیا تم اس کی یہ خواہش پوری کرو گے۔"

وہ چپ چاپ تسبیح پش کرنے لگا۔

"نہیں ڈاکٹر خوشنود..... میں نہیں آ سکتی۔ جس ماں کی تلاش نے مجھے اتنا بھٹکایا، اس کے مل جانے نے مجھے اور الجھا دیا ہے جب تک وہ میری اس بات کا تسلی بخش جواب نہیں دیں گی کہ وہ کیا وجہ تھی جس نے انہیں اپنی اولاد تک کو فراموش کر دینے پہ مجبور کر دیا،

Urdu.com
Sahaba
URDU PHOTO

میں کبھی انہیں اپنی ماں تسلیم نہیں کروں گی۔ مجھے اپنی بچپن کی تمام خوفزدہ کر دینے والی راتوں اور محروم اجاڑ دنوں کا حساب چاہیے۔"

"خدا سے دعا کیجیے کہ وہ آپ کی ماں کو اس حساب کتاب کے لیے زندہ رکھے۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جی..... کیا مطلب؟"

"مطلب یہ مس مقدس کہ آپ تسلیم کریں یا نہ کریں اس حقیقت کو جھٹلا تو نہیں سکتیں کہ وہی آپ کی ماں ہیں۔ ایک اکلوتی اولاد ہونے کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے کہ ان کے آخری وقت میں ان کے قریب رہیں۔ ان کے کیا فرائض تھے کیا نہیں، اس بحث میں پڑنے کا فی الحال وقت نہیں ہے۔" اس نے صاف صاف کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس کی توقع کے عین مطابق آدھے گھنٹے کے اندر اندر مقدس وہاں موجود تھی۔ اس نے کترا کے نکل جانا چاہا لیکن مومنہ نے ہاتھ کے اشارے سے رکنے کے لیے کہا۔

"مقدس! میری بیٹی! کیا تمہارے دل میں اپنی ماں کے خلاف اتنا زہر بھر دیا گیا ہے کہ برسوں بعد ملنے کے باوجود تم نے اپنی ماں کے گلے لگنا گوارا نہ کیا۔ میری بانہیں پھیلی رہ گئیں اور تم..... واپس چلی گئیں۔"

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں میرے دل میں زہر ہے [illegible] میں کسی قسم کا کوئی شک [illegible] آپ نے خود کچھ بھی کہا میں اس کا یقین کرتی ہوں اور آپ اور جو بھی بتائیں گی میں اس کا یقین کرلوں گی لیکن آپ بتائیں تو سہی..... مجھے جواب تو دیجیے کہ مجھ سے..... میری ذات سے، آپ کو کیا خطرہ ہو سکتا تھا جو آپ نے خود کو اتنا چھپا کر رکھا۔"

"مجھے تم سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ مجھے کسی سے [illegible] خطرہ نہیں تھا [illegible] خوفزدہ تھی۔ اپنے اندر کی محبت کی ماری عورت سے ڈرتی تھی، اپنی ممتا سے خائف تھی مجھے خطرہ تھا تو اس بات سے کہ کہیں میرے اندر کی محبت پھر مجھ پہ حاوی نہ ہو جائے۔"

"اپنی اولاد سے محبت کرتے ہوئے ڈرتی تھیں آپ کیوں؟" وہ بے بسی سی کرنے کے انداز میں نزدیکی کرسی پہ بیٹھ گئی۔

"میں آپ کی یہ مبہم باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کیا اتنے سالوں میں کبھی آپ کو مجھے کھو دینے کا ملال نہیں ہوا۔ کبھی بھی آپ میرے لیے نہیں تڑپیں۔ کبھی میرے لیے فکر مند نہیں ہوئیں؟"

"میں نے تمہیں کھویا نہیں تھا مقدس میں خود کھو گئی تھی اور دیکھو آج تمہیں مل گئی

ہوں۔ تم مجھ سے جدا نہیں ہوئی تھیں صرف میری آنکھوں سے اوجھل ہوئی تھیں پھر ملال کس بات کا۔ ہاں کسک تھی سو وہ تو نصیب کا ایک حصہ جان کے سنبھال لی سینے میں۔ میں تو یہ جان کے خود کو مطمئن کر لیتی کہ تم اپنوں میں ہو۔ اپنے باپ کے گھر..... اپنے خاندان کے ساتھ..... ایک مضبوط چھت کے نیچے۔"

"ہونہہ..... اپنے۔" وہ اداسی سے مسکرائی۔

"میں نے بیس سال اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے گزارے ہیں۔ عمر کا آدھا حصہ..... ہاں وہ حصہ جس میں کسی بھی انسان کو ماں باپ کی سب سے زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ حصہ میں نے ان دونوں رشتوں سے یکسر انجان رہتے ہوئے گزارا۔ بہت سے لوگوں کے ماں باپ نہیں ہوتے، کئی لوگ پیدائشی یتیم ہوتے ہیں لیکن وہ کم از کم اتنا تو جانتے ہیں کہ ان کے ماں باپ کی قبریں کہاں ہیں؟ وہ کون تھے کیسے تھے؟ اور میں..... میں تو اتنا بھی نہیں جانتی تھی میرے ماں باپ زندہ ہیں یا پھر.....

میں تو اپنی ماں کے نام سے بھی انجان تھی۔ بیس سال بعد میں جان پائی کہ وہ دونوں زندہ ہیں اسی زمین کے کسی کونے پہ موجود ہیں۔ بابا جان کے مجھ سے دور رہنے کی وجہ کیا تھی وہ سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن آپ تو آزاد تھیں پھر کیوں یہ خود ساختہ دیواریں کھڑی کر لیں [illegible] آزاد کب تھی..... میں آزاد کب ہوں۔ تم جانتی ہو مقدس پھولوں کے رنگ [illegible] ہوتے ہیں..... میں بھی نہیں جانتی تھی..... تمہارا باپ جانتا تھا لیکن وہ مجھے بتا نہیں [illegible] پھر..... پھر میں خود ہی جاننے لگی جب کسی پھول کو محبت کا پانی ملنا بند ہو جائے [illegible] کی جڑوں میں زہر اتر جائے تو..... تو آہستہ آہستہ وہ کالا پڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ میری جڑیں بھی ایک دم زہریلی ہو گئی تھیں..... میرے دل کے کالے پن نے مجھے یہ سب کرنے پہ مجبور کیا۔"

"کیا؟" وہ بے تابی سے بول اٹھی لیکن مومنہ کا دھیان اس پہ نہیں تھا وہ اپنی ہی کہتی رہی۔ "اور جانتی ہو اس پھول سے نازک دل کو کالا کس نے کیا۔ نفرت نے..... نفرت چیز ہی ایسی ہے، پیار چاہے تو پتھر میں بھی خوشبو بھر دے اور نفرت..... نفرت بھی کمزور جذبہ نہیں۔ نفرت چاہے تو پھول میں آگ لگا دے۔ مجھ جیسی محبتوں کی ماری کو جھلسا کے سراپا شعلہ کر دے میں نے اس نفرت کو سنبھال کے رکھ لیا اس نفرت کے بغیر میں بڑی کمزور تھی۔ محبتیں کمزور بنا دیتی ہیں نا..... میں نے نفرت کے سہارے مضبوط بننا چاہا، اتنی سنگدل بننا چاہتی تھی میں کہ....." وہ بولتے بولتے رک گئی اک نظر دونوں کو دیکھا۔

Urdu Photo

"کہ زریاب کو سزا سناتے ہوئے میرا دل نہ کانپے۔"

"مگر زریاب خٹک کو قانون نے سزا دی تھی۔" اب تک لاتعلق بیٹھا خوشنود کہہ اٹھا۔

"ہاں..... قانون نے ہی سزا دی تھی۔ فیروز لالہ کے قتل کی..... لیکن..... زریاب قاتل نہیں ہے۔" مومنہ نے کہا۔

☆☆☆

"کیا کمایا تو نے حضرتی؟" بی بی جان نے اپنے گورے، پھولے پھولے مگر گہری لکیروں سے بھی سخت ہتھیلی والے ہاتھ بغور دیکھتے ہوئے خود سے سوال کیا۔

"زندگی میں سب کچھ "بھرم" ہی تو نہیں ہوتا۔ کیا ہوتا ہے یہ "بھرم" اتنی کھوکھلی چھت..... اتنی ہلکی چادر..... یہ کیا سر چھپائے گی۔ پھر بھی فقط اسے سلامت رکھنے کے لیے انسان سب کچھ داؤ پر لگانے کو تیار ہو جاتا ہے۔ یہ بھرم ہی تو تھا جس نے اتنے سالوں تک یہ کھیل مجھ سے کروایا۔ یہ ٹھیک ہے کہ پہلے بیٹی کی محبت نے یہ سب کرنے پر مجبور کیا لیکن پھر..... پھر کیا ہوا..... نہ بیٹی رہی..... نہ اس کی خوشیاں..... بیٹا بھی نظروں سے دور ہو گیا..... اس کے بعد صرف یہ کم بخت بھرم ہی تو رہ گیا تھا جسے بچانے کے لیے اتنے سال تسلسل سے یہ تماشا ہوتا رہا۔ کیسے اپنے بچوں کی نظر میں خود کو ہلکا کرتی میں، اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے، لیکن وقت سے بڑا جابر اور کون ہے..... منوا ہی لیا مجھ سے سب کچھ..... اگر یہ سب یونہی ہونا تھا تو..... درمیان کے بیس سال کیوں آئے؟ اگر آج مجھے اپنی اولاد کی نظروں سے گرنا ہی تھا تو کیوں بے کار اتنی زندگیاں برباد ہوئیں۔

وہ خاموشی سے اپنا احتساب کرتی رہیں۔ تمام قصہ کہہ دینے کے بعد وہ وہاں ٹھہر نہ سکیں۔ زریاب کی حیران بے اعتبار اور افراسیاب اور دراب کی ملامتی نظروں کی وہ تاب نہ لا سکیں۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے وہ اپنے اندھیرے کمرے [illegible] ڈھونڈ رہی تھیں۔

بے شک ضمیر نے یہ کوڑا آج پہلی بار لہرا کے انہیں مارا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ بیس سال تک ان کا ضمیر دل کے کسی کونے میں سویا رہا تھا۔ وہ تو عرصے سے چٹکیاں بھر رہا تھا اور اس نے تو پہلی چٹکی تب بھری تھی جب ان کی آنکھوں کے سامنے زریاب بندوق لہراتا ہوا نکلا تھا۔

انہیں اپنے اقدام کے سنگین نتائج کا اندازہ تب ہی ہو گیا تھا۔ وہ تو سمجھتی تھیں زریاب بیوی سے بدگمان ہو کے اس سے تعلق توڑ لے گا اور یوں وہ بڑی آسانی سے مومنہ کا پتا صاف کر پائیں گی لیکن زریاب خٹک جیسے پختون النسل کے سامنے اس کی بیوی کے

خود ساختہ معاشقے کی تفصیل اتنے بے رحم الفاظ کے ساتھ بیان کرتے ہوئے وہ بھول گئیں کہ بھلے اپنے اصل سے وہ کتنا ہی دور دور رہا ہو، ہے تو ایک "خانزادہ" ہی جسے غیرت سے آگے کچھ سوجھتا نہیں۔ اسے بھی کچھ نہ سوجھا۔ پل بھر میں جان سے عزیز بیوی اور قابلِ اعتبار یار کے خون کا پیاسا بن گیا اور یہ پیاس اسے پھانسی کے تختے تک لے گئی۔

زرسانگہ اپنی حرکت کا اتنا سخت انجام سہہ نہ سکی اس کے دماغ کی شریان پھٹ گئی۔ ذہنی حالت تو اس کی دن بدن کمزور ہوتی ہی جا رہی تھی یہ آخری اور شدید جھٹکا اس کا کمزور دماغ سہہ نہ سکا اسے ہر غم سے بے نیاز کر گیا۔

خان جی، وہ تو تب ہی لڑکھڑا گئے تھے جب ان کا بیٹا خون کی ایک نئی تاریخ رقم کرنے چلا تھا۔ ان کو فالج کا پہلا حملہ اسی دن ہوا تھا پھر زریاب کی گرفتاری، موت کی سزا، بیٹی کی اچانک موت یہ سب حادثات انہیں بستر تک کا ہی کر گئے۔ برسوں سے وہ اپنے رعب و دبدبہ والے اونچے لمبے خان جی کو بستر پہ مفلوج بے بس، بے زبان پڑا دیکھ کے کڑھ رہی تھیں۔ لیکن جو جھوٹ بول دیا تھا وہ نبھانا تو تھا ہی۔ اب سچ کہہ بھی دیتیں تو کیا ہو جاتا۔ کیا فیروز زندہ ہو جاتا؟ زریاب آزاد ہو جاتا؟ یا زرسانگہ لوٹ آتی؟ وہ چپ چاپ اس چٹکیاں بھرتے ضمیر کو نظر انداز کرتی رہیں اور مقدس..... اس کی صورت ایک مسلسل عذاب ان کے سر پہ بیس سال تک مسلط رہا۔

مقدس کی صورت میں ایک چلتی پھرتی مومنہ کیا کم سزا تھی ان کے لیے..... اس کی صورت انہیں وہ سارا واقعہ بھولنے نہ دیتی راتوں کو اس کا مچل مچل کے رونا ان کے دل میں [illegible] کمرے میں گھنٹوں گھنٹوں چل کے جاتی اپنی ماں کو ڈھونڈتی پھرتی وہ رونی صورت کی بچی انہیں خود سے سوال کرتی محسوس ہوتی۔ وہ چڑ جاتیں اس کے سامنے کم سے کم [illegible] مخاطب کرنے کی نوبت تو اکثر آتی ہی نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھیں اس حویلی کی تاریخ سے مومنہ کا باب ہی مٹ جائے۔ کسی کو یاد نہ رہے کبھی زریاب کی کوئی بیوی یہاں آئی بھی تھی اور اس میں وہ خاصی حد تک کامیاب رہی تھیں۔ بڑی بہو یہاں نہ ہونے کی وجہ سے سارے قصے سے لاعلم تھی ہی، چھوٹی بہو اس واقعے کے کئی سال بعد آئی۔ سب مومنہ کے بارے میں وہ ہی جانتے تھے جو بی بی جان نے زریاب سے کہا تھا۔

دراب بھائی کی طرف سے ملنے والی شادی کی تصویروں میں سنہری بالوں، گلابی اور سنہری رنگت والی، بلوری آنکھوں والی بھابھی کو غیر ملکی ہی سمجھا اور کسی نے اس کی یہ غلط فہمی عرصہ تک دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نتیجتاً اکثر لوگ یہی جانتے زریاب کی بیوی کوئی "میم" تھی۔ اس کا ذکر اس گھر میں ممنوع تھا۔

Urdu Photo

شاید رفتہ رفتہ لوگ اس قصے کو یکسر فراموش کر دیتے اگر..... مقدس کا وجود نہ ہوتا۔ اس لیے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے بے ضرر وجود سے نفرت کرنے پہ مجبور ہو گئیں اس کی سوال کرتی آنکھیں انہیں زہر لگتیں ایسا لگتا جیسے مومنہ سامنے آ کھڑی ہو اور کہہ رہی ہو۔ ''کیوں؟ بی بی جان کیوں؟''

''آہ کیوں؟'' وہ خود کو کوسنے لگیں۔ ''کیوں میں ایک مومنہ کے بعد دوسری مومنہ سے کھیلتی رہی۔ کیا اس کی ماں کافی نہیں تھی میری نفرتوں کی تسکین کے لیے جو میں اس معصوم سے بھی بدلے لیتی رہی شاید میں ڈرتی تھی وہ اس قابل نہ ہو جائے کہ اپنی ماں کا بدلہ مجھ سے لینے میرے مقابل آ جائے۔ ہائے حضرتی تو نے کیا کیا..... کیا زریاب کا اس کی نسل کا اس خاندان پہ کوئی حق نہ تھا کیا اس کے حصے کی خوشیاں ہی رہ گئی تھیں تیری بیٹی پہ قربان ہونے کے لیے۔ تیری وجہ سے وہ در بدر ہوا، اس کا گھر اُجڑا، اس کی بیوی رسوا ہوئی پھر بھی تو نے بس نہ کیا اس کی معصوم امانت تک کو کچلتی رہی تمہاری خسیانی ہوئی انا۔''

وہ اُٹھیں اور خان ارباب خٹک کے کمرے میں داخل ہوئیں۔

کئی دنوں سے بے چین اور مضطرب خان ارباب خٹک کے ضعیف چہرے پہ اس وقت اطمینان پھیلا ہوا تھا۔ ان کا ابھری رگوں والا اپنا ہاتھ ابھی تک زریاب کے ہاتھوں میں تھا بلکہ شاید جب سے وہ لوٹا تھا یہ ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔ وہ تھکے تھکے قدم چلتی ان کے سرہانے پہنچ گئیں۔

''خان جی!'' انہوں نے سرخی مائل سوجی آنکھیں جھکائے جھکائے عرض کی۔

''خان جی! مجھے معافی دلا دیں، مجھے زریاب سے معافی دلا دیں خان جی.....'' ان کے لہجے میں اتنی عاجزی تھی، اتنا کرب تھا کہ وہ تڑپ کے اٹھ کھڑا ہوا۔

''بی بی جان! مجھے گناہ گار مت کیجیے اس طرح میرے سامنے ہاتھ جوڑ کے مت کھڑی ہوں کیوں مجھے میری ہی نظروں سے گرانا چاہتی ہیں آپ؟'' اس نے شانوں سے تھام کے انہیں اپنے قریب بٹھایا۔

''نظروں سے تو میں گر گئی ہوں لیکن مجھے گلہ نہیں یہ میرے اپنے اعمال ہیں جنہوں نے میری بزرگی ساری نسل کے سامنے پامال کی۔ میں کسی رعایت کی مستحق تو نہیں لیکن معافی کا حق تو رکھتی ہوں۔ مجھے معاف کر دو زریاب..... تم مجھے معاف کر دو، مقدس مجھے معاف کر دے تو شاید دل کچھ ٹھہر جائے ورنہ اب اپنے ہی دل کی ملامتیں سہی نہیں جاتیں۔ نجانے مومنہ..... مومنہ کہاں ہوگی اس وقت۔'' زریاب جیسے کسی خواب سے چونکا تھا۔

''ہاں..... مومنہ..... مومنہ کہاں ہوگی.....؟ تم کہاں ہو مومنہ؟''

''وہ ہوتی تو میں اس سے بھی معافی مانگ لیتی۔ میں صرف تمہاری ہی مجرم نہیں ہوں میں اس عورت کی مجرم بھی ہوں جو نجانے کتنے خواب آنکھوں میں سجا کے اس گھر میں سہاگن بن کے آئی تھی۔ میں اس معصوم بچی کی مجرم بھی ہوں، اپنے بیٹے کی..... اپنے دل کے ایک ٹکڑے کی..... میں نے تمہیں برباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔''

''نہیں بی بی جان.....! آپ کم از کم میری مجرم تو نہیں ہیں۔ میں اپنی بربادی میں کسی کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتا۔ آپ کو بھی نہیں۔ اپنی بربادی میں سب سے بڑا ہاتھ خود میرا ہے میری بے اعتبار محبت کا۔ بلکہ آپ تو مومنہ کی مجرم بھی نہیں اس کا سب سے بڑا مجرم میں ہوں۔ میرے اندھے جذبات اور جنون اسے لے ڈوبے۔ اپنی بیٹی کی تمام تر محرومیوں کا سبب بھی میں ہی ہوں۔ اس سارے قصے میں مجھے اور تو کوئی مجرم نہیں دکھائی دیتا سوائے اپنے۔ یہ میں ہی تھا بی بی جان..... یہ میرا کمزور عشق تھا جو بدگمانی کا ایک ہلکا سا وار نہ سہہ سکا۔ آپ کیوں معافی مانگتی ہیں بی بی جان..... معافی تو مجھے مانگنا ہے مقدس سے..... مومنہ سے.....

''زر..... تم نے..... حضرتی کو..... معاف..... بیٹا..... اپنی بہن..... بہن کو..... بھی.....'' باچا جان نے اسے متوجہ کر کے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

''ہاں زریاب..... اپنی بہن کے لیے تمہارے دل میں جو گلے شکوے ہیں، وہ دور کر لو..... اس کی روح کو پچھتاوے کے بوجھ سے آزاد کر دو..... اس کی بخشش کے لیے دعا کرو۔'' بی بی جان نے التجا کی۔

''میں نے کہا ناں بی بی جان..... میرے دل میں کسی کے خلاف کوئی شکوہ نہیں۔ اس دل میں اپنے ہی سوال اس قدر ہیں کہ.....'' وہ بات ادھوری چھوڑ کے اُٹھ کھڑا ہوا۔

اندر وا اندر دی وگدا رہندا
پانی درد حیاتی دا

(اندر ہی اندر کہیں بہتا رہتا ہے زندگی کے درد کا پانی)

''اور یہ درد تو میں نے خود مہمان کیا ہے..... یہ پچھتاوے تو میں نے خود آگے بڑھ کے خریدے ہیں۔ وہ سارے عہد وہ سارے پیمان میں نے ایک پل میں بھلا دیے مجھے کچھ بھی یاد نہ رہا۔

اس کے صبیح چہرے پہ نور کا وہ ہالہ
اس کے نکھرے سچے لہجے میں کوکتے وعدے
اس کی شفاف آنکھوں کے آئینے

Urdu.com
UrduPhoto.com
Saba

اور اپنا وہ وعدہ..... جو میں نے کبھی بڑے سچے دل سے کیا تھا۔" اسے یاد آنے لگا۔

"میں تاں دوزخ سڑساں
جے میں مکھ ماہی ولو موڑاں"

اور میں نے مکھ موڑ لیا..... کس سفاکی کے ساتھ..... کس بے دردی کے ساتھ اور کس بھدے پن کے ساتھ۔

سالوں بعد آج وہ اس کمرے میں موجود تھا جس کی دیواریں اس کے جنون خیز عشق کی ہر ہر ادا کی راز دار تھیں۔ وہ جدھر جدھر جاتی زریاب اسے تکے جاتا۔

آئینے کے سامنے پل دو پل رک کے ریشمی بالوں کی پہلے سے کی گئی چوٹیوں کے بل اور کستی ہوئی اکتائی اکتائی سی مومنہ.....

"اُف یہ بال، کتنی سکھی تھی میں نانی سے بال گنوا کے دو دو دن فکر ہی نہ ہوتی تھی اور اب....." وہ مڑ کے شکایتی نظروں سے اسے دیکھتی۔

"تمہاری نئی نئی فرمائشیں..... مینڈھیاں مت کرو..... بال کھلے چھوڑو..... وغیرہ وغیرہ..... بھلا تمہیں میرے بالوں سے کیا؟"

"کیا کہا؟ پھر سے کہنا" تکیے پہ سر رکھے ہوئے اسے دیکھتے دیکھتے وہ اچانک اُٹھ بیٹھا۔ "مجھے کیا؟ مجھے نہیں تو اور تمہیں مطلب ہوگا ان بالوں سے؟ اتنے خوبصورت ریشمی اور لمبے بالوں کی قدر ہی نہیں عجیب رسیاں سی بن کے جال پھیلا دیتی تھیں سر پہ اور اب بھی کون سا میری "نئی نئی فرمائشیں" پوری ہو رہی ہیں۔ بال کھلے رکھنا تو ایک طرف تم میری پسند کے مطابق ڈھیلے سے بل والی چوٹی بھی نہیں کرتیں کس کسا کے یہ دو سینگ نکالتی ہو۔" وہ اس کی دو چوٹیوں پر تنقید کرتا۔

"کیا کروں، ڈھیلے بالوں میں سر دکھنے لگتا ہے۔ اتنے سالوں کی عادت جو ہے لیکن..... رنگ جاؤں گی آہستہ آہستہ تمہارے رنگ میں صیب۔" جب کبھی وہ ترنگ میں ہوتی تو اس کے چڑنے کے باوجود اسے "صیب" کہہ کے ضرور پکارتی۔

"سنو!" اس کا لہجہ بدل جاتا اسے آئینے کے آگے سے ہٹتے دیکھ کے۔

"تم کچھ دیر اور کھڑی رہو ناں یہاں۔"

"کیوں؟"

"اچھا لگتا ہے تمہیں ایک نظر میں ہی "دو دو" بار دیکھنا۔" اس کی وارفتگی پہ اس کے نین شہد ٹپکانے لگتے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا اس دریچے کے قریب آیا جہاں صبح صادق کے وقت بیٹھ کے عبادت کرنا مومنہ کو بے حد پسند تھا۔ زریاب بھی صبح خیز تھا لیکن اس نے تو شاید کبھی پو پھٹنے کا انتظار بھی نہیں کیا ہوگا۔ سورج کی پہلی کرن کو خوش آمدید کہنے کے لیے وہ ہمیشہ اس دریچے کے پردے ہٹا کر کھڑی ہو جاتی اور جب وہ جاگتا اسے ڈھونڈتا ہوا سیدھا یہیں آتا، اسی دریچے کی طرف جو اس کے کمرے کے ساتھ متصل اسٹوڈیو کی پچھلی طرف کھلتا ہے۔ اس نے گرد اور سیلن سے بھری اسٹوڈیو کی فضا میں سانس لینے میں دشواری سی محسوس کی۔ پرانے کاغذوں کے ڈھیر نے عجیب سی مہک پیدا کر رکھی تھی، اور خشک ہوتے پینٹ سیلن زدہ سی بدبو پیدا کر رہے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کے پردے کھینچے۔ مختصر سی بالکونی میں پتھر کا وہ بینچ آج بھی موجود تھا لیکن اس پہ جامن کے گہرے گہرے رنگ والے پتوں کا سایہ نہ تھا۔ ایک ٹنڈ منڈ سا درخت افسردہ سا جھانک کے نجانے کسے ڈھونڈ رہا تھا۔ بینچ کے ساتھ ابھی بھی قطار میں وہ گملے لگے تھے لیکن نہ تو ان میں گلاب باقی تھے نہ موتیا۔ وہ تھکا تھکا سا اس گرد میں اٹے بینچ پہ بیٹھ گیا لیکن اگلے ہی لمحے تڑپ کے اُٹھا تھا جیسے یہاں، اس مقام پہ بیٹھ کے اس سے کوئی بے ادبی سرزد ہو گئی ہو۔ اسے یاد آیا، مومنہ کا صبح کی اولین ساعت جیسا ہی پاک اور معصوم سا چہرہ..... سفید سوتی دوپٹے میں لپٹا ہوا..... وہ یہیں اسی بینچ پہ بیٹھ کے تلاوت کرتی تھی اور سامنے بیٹھا عقیدت سے اسے تکا جاتا۔

اس کے غیر محسوس سی حرکت کرتے گلابی لبوں کو..... ہل ہل کے پڑھتے ہوئے کانوں میں ڈولتی بالیوں کو.....

جھکی ہوئی آنکھوں کی لرزیدہ پلکوں کے سائے کو.....

سورج کی کرنوں سے دمک اُٹھنے والی ناک کی لونگ کو.....

پیشانی پہ آویزاں اس پر نور سے عکس کو.....

کیوں.....؟

کیوں.....؟

کیوں بھلا دیا میں نے اس نور کو.....؟ کیوں نہ اس وقت مجھے یہ پاکیزگی یاد آئی.....؟ کیسے یقین کر لیا میں نے کہ مومنہ..... مومنہ اور فیروز..... کیا یہی تھا میرا عشق یہی تھی میری محبت.....؟ یہی دعوے کیے تھے میں نے..... اتنی بودی محبت..... اتنے کھوکھلے عہد..... میں جو خود کو بڑا روشن دماغ تعلیم یافتہ، سلجھا ہوا اور مجبور شخص سمجھتا رہا ہمیشہ خود کو اس سارے روایتی اور دقیانوسی سیٹ اپ میں اجنبی تصور کرتا رہا۔ اصل میں کیا نکلا؟ ایک جاہل، کم نگاہ، وہی فرسودہ اور روایتی مرد..... جو کسی تیسرے شخص کی بے سروپا باتوں پہ بغیر

urdu.com
Sahar URDU PHOTO

کسی ٹھوس اور واضح ثبوت کے ہی ایمان لے آتا ہے..... جو غیرت اور انا کے آگے محبت اور اعتبار جیسے جذبوں کے پرخچے اُڑا دیتا ہے..... اور..... جو.....''

''خان صیب..... خان صیب''

وہ پتا نہیں اور کتنی دیر خود کو کٹہرے میں کھڑا کر کے خود ہی پتھر مارتا رہتا کہ اورنگزیب کی آواز پہ چونک اٹھا۔ اسٹوڈیو سے نکل کے دیکھا تو وہ عجیب وحشت زدہ انداز میں کمرے میں گھوم گھوم کے اسے ڈھونڈ رہا تھا۔

''کیا بات ہے اورنگزیب؟'' اس نے متوجہ کیا۔

''وہ..... خان صیب..... بڑے خان جی..... اپنے باچا جان گزر گئے۔'' وہ دھاڑیں مارنے لگا۔

☆☆

''لیکن زریاب..... وہ قاتل نہیں ہے۔'' مومنہ کے اس انکشاف نے خوشنود اور مقدس دونوں کو دم بخود کر دیا۔

حیرت کا ایک برفیلا شکنجہ تھا جس نے ان دونوں کو یوں منجمد کر دیا کہ وہ کوئی اور سوال کرنے کے قابل بھی نہ رہے۔ سختی سے آنکھیں بند کر کے لیٹی مومنہ نے کچھ دیر کسی آواز کا انتظار کیا اور پھر رک رک کے بتانے لگی۔

''ہاں وہ قاتل نہیں ہے لیکن..... صرف قانون کی نظر میں ہی اسے بے قصور ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ مجھ سے پوچھو..... مجھ سے پوچھو کہ اس کے ہاتھوں پہ کس کس کا لہو ہے..... مجھ سے حساب مانگو میں بتاتی ہوں اس سے کتنے قتل ہوئے ہیں۔ کتنے جذبے بے موت مارے گئے ہیں، کتنے خواب سولی چڑھے ہیں، کتنی آرزوئیں سسک سسک کے فنا ہوئی ہیں اور کتنی محبتوں کا خون ہوا ہے اس شخص کے ہاتھوں..... لیکن..... اس لیے..... صرف اس لیے میں نے.....'' اس کی بار بار اٹکتی زبان ٹھٹک کے رک گئی۔ ''آپ نے پہلے اتنے جھوٹ کیوں بولے..... وہ ساری جھوٹی کہانی.....'' خوشنود نئے سرے سے مخمصے میں پڑ گیا۔

''نہیں..... میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے کبھی کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میں جھوٹ بول ہی نہیں سکتی، میں نے پہلے تم سے جو کچھ کہا تھا اس کا حرف حرف سچائی لیے ہوئے ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے تم سے بہت سی باتیں چھپالی تھیں۔ کچھ پردے پڑے رہنے دیئے تھے۔'' وہ الزام سہہ نہ سکی، اپنی صداقت تسلیم کرانے کے لیے جیسے اس میں نئی قوت پیدا ہو گئی۔ اس کی آواز اب پہلے سے بلند تھی اور واضح بھی۔

''میں کبھی بھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔ جھوٹ بولنے سے بچنے کے لیے ہی تو میں وہاں سے بھاگ نکلی تھی۔ جھوٹ بولنا بھی میرے لیے ناممکن تھا اور سچ..... سچ بتانے سے زریاب کو سزا نہ مل پاتی اور میں اسے سزا سے کیسے بچنے دیتی۔ کیا غیرت اور حمیت صرف مردوں کی میراث ہے۔ کیا اپنی عزت پہ بن آتے دیکھ کے خون کی ندیاں بہانا صرف مردوں کا شیوہ ہے۔ کیا کسی عورت کے اندر بدلے کی آگ نہیں بھڑک سکتی جب اس کی وفا اور عزت پہ وار کیا جائے۔ کیا عورت کے اندر وفا، ممتا اور محبت کے خزانے بھر کے قدرت غیرت اور وقار رکھنا بھول گئی تھی؟ نہیں..... عورت بھی اپنی ذات اور اس کے تقدس کے حوالے سے اتنی ہی غیرت مند ہوتی ہے جتنا کہ ایک مرد اور پھر میرے جیسی عورت..... جس نے عزت کو محبت پہ ترجیح دی ہو، پہاڑوں نے اپنی گود میں لے کر جسے بچپن سے ہی اپنے جیسی سربلندی اور پختگی عطا کر دی ہو، جو تن تنہا جنگلوں میں بسنے والی غیر قوم کے ساتھ سر اٹھ کے ایک عمر بتا چکی ہو۔ میرے لہو میں یہ سرکشی گردش کر رہی تھی، میں خود پر اٹھنے والی نگاہ بھسم کرنے کی قوت رکھتی تھی، خود پہ اٹھنے والی انگلی کیسے سلامت رہنے دیتی۔

تمہارے باپ نے مجھے پہاڑوں کی گود سے نکالا، شہر میں بسایا لیکن وہ میرے اندر کی خودسر اور غیور بنجارن کو مکمل طور پہ تبدیل نہ کر پایا۔ اس کی محبت نے وقتی طور پر اس ناموں پہ مرنے والی عورت کو سلا ضرور دیا تھا۔ کتنا ہی عرصہ اس کی محبت کے خمار میں سرشار میں ایک نامعتبر سی زندگی گزارتی رہی، اس کی ماں اور اس کی بہن کے طنزیہ اور تذلیل میں ڈوبے فقرے میرے کانوں تک آتے لیکن ہلکی سی دستک دے کے لوٹ جاتے، وہاں زریاب کے کہے میٹھے بولوں کا شور ہوتا تھا۔

اس کے خاندان کی نفرت انگیز اور حقارت آمیز نظریں مجھ تک اٹھتیں لیکن میرے اندر کوئی شعلہ نہ بھڑکتا میری آنکھوں کے آگے تو زریاب کے مسکراتے چہرے اور جذبے لٹاتی نظروں کا ست رنگا پردہ پڑا ہوا تھا۔ لیکن جب خود زریاب کے بولوں میں وہی زہر اُترا..... جب خود اس کی آنکھوں میں میں نے بے اعتباری دیکھی تو کیسے میری مدہوشی نہ ٹوٹتی۔ اس دن..... اس پل..... میرے اندر کی وہ پہاڑن پھر سے جاگ اٹھی تھی اور کسی طور نہ بہل رہی تھی۔'' وہ ہانپنے لگی۔ خشک ہوتے لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے اس نے دھندلی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھنا چاہا، سائے سے اس کی آنکھوں کے آگے لہرائے اور اس نے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ اس کی ناتوانی نے اس کی تمام حسیات کو اکٹھے مستعد

Urdu.com
Urdu Photo

رہنے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ مسلسل بولتے رہنے سے اس کی بصارت نے اندھیرے اوڑھنے شروع کر دیئے تھے۔ لیکن دماغ جاگ رہا تھا اور اس پہ وہ سارا منظر بہت واضح..... بہت صاف دکھائی دے رہا تھا۔

"زر..... یاب....." فیروز دھاڑا۔ "ہوش میں رہ کر بات کرو۔" اگرچہ وہ اس کی باتوں کے پس منظر سے ناواقف تھا لیکن میرے حوالے سے کہے گئے گھٹیا جملے سن کر اپنا تحمل برقرار نہ رکھ پایا۔

"ہوش میں تو میں اب آیا ہوں۔ تم تو شادی شدہ تھے ناں اور وہ بھی دو نے سٹے کے ساتھ..... تمہاری ایک نہیں دو دو بہنیں تمہارے سسرال بیاہی گئی تھیں اس لیے خود شادی کر کے اپنے لیے مسائل کھڑے کرنے کے بجائے تم نے زیادہ محفوظ راستہ اپنایا۔ تمہیں تو صرف عیاشی کرنا تھی پھر چاہے وہ تمہارے اپنے ہی دوست کی بیوی کیوں نہ ہوتی۔ اور وہ..... وہ عورت اسے تو دولت اور مقام ہی چاہیے تھا پھر اگر وہ دو عاشقوں کے ساتھ ملتا تو کیا برا ہوتا۔"

"میں کہتا ہوں خاموش ہو جاؤ زریاب تم اپنے ہوش میں نہیں....."

غصے کی شدت سے اس کی آواز کانپ رہی تھی لیکن زریاب واقعی ہوش میں نہیں تھا۔ اس کے دل و دماغ پہ اس وقت زہر چڑھا ہوا تھا وہ بولتا رہا۔

"تم نے چند ہی منٹوں میں سارا کھیل سوچ لیا، ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مجھ سے اس کی شادی کرواتے ہوئے اپنا حصہ واضح رکھا اور یہ کرتے ہوئے تم نے پاک رشتوں کو استعمال کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔ اپنی پوزیشن صاف رکھنے کے لیے اور مومنہ سے تعلق جوڑے رکھنے کے لیے تم نے اسے بہن کہہ کر مجھے دھوکا دینا چاہا۔"

"بس..... بس کرو اپنی یہ بکواس ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ تمہارا اور کیا رشتہ ہے۔"

"تمہارا اور میرا کوئی رشتہ نہیں۔ تمہارے اور میرے بیچ صرف ایک عورت تھی۔ اب یہ راز کھل چکا ہے اب کچھ باقی نہ بچے گا نہ تم نہ وہ..... نہ تم دونوں کا مکروہ اور گھٹیا تعلق۔"

"گھٹیا تم خود ہو اور مکروہ تمہاری سوچ ہے۔"

"اور تم دونوں تو بہت اعلیٰ اور ارفع ہو۔ وہ بدکردار عورت شوہر کی غیر موجودگی چند دن بھی نہ برداشت کر سکی اور اپنے مرد کے گھر میں ہی، اسی کی چھت کے نیچے اپنا یار بلوا کے عشق کے تماشے کرتی رہی اور جب بھانڈا پھوٹا تو گھر اور اولاد کو چھوڑ کے اسی کے ساتھ چل پڑی۔"

اس کے تفصیلی الزام پہ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا خود فیروز لالہ بھی

لڑکھڑا سا گیا۔

"یہ سب بکواس کس نے کی تم سے؟ تم نہیں جانتے ہو وہ میرے ساتھ کسی طرح اور کس حال میں آئی ہے۔ یہ ٹھیک ہے اسی نے مجھے بلوایا تھا مگر....." زریاب نے پوری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس پہ دوبارہ بندوق تان لی۔

"میری ماں نے خود تم دونوں کو دیکھا تھا عزت اور شرم کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے اور میرے لیے اس سے معتبر گواہی اور کوئی نہیں۔" اچانک فیروز لالہ اس پہ پل پڑا۔ وہ اس سے بندوق چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا خون بھی جوش میں آ گیا تھا۔

"اگر تم میری بہن کے شوہر نہ ہوتے تو میں تمہارا خون بہا دیتا۔" اس نے بندوق کا رخ اس کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے اور میں اسی طرح جیسے بیٹھی گم صم یہ تکلیف دہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ میں چلا کے لالہ سے کہنا چاہتی تھی۔ "بہا دو اس کا خون..... مت پروا کرو یہ تمہاری بہن کا شوہر ہے..... یہ میرا شوہر نہیں ہے یہ..... یہ تو جانور ہے..... جانور..... جس کا شعور فنا ہو چکا ہے۔ جس کے اندر سے ہر جذبہ مٹ چکا ہے اب تو یہ سر سے پیر تک جانور ہے غلیظ وحشی اور درندہ جانور..... اور کوئی درندہ میرا شوہر نہیں ہو سکتا۔"

لیکن میں چلا نہیں سکتی تھی۔ میں سکتے کے عالم میں تھی۔ ایک ایسا سکتہ جو صرف جسم پر قابض ہوتا ہے، روح کو سب سہنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ میں سب دیکھ رہی تھی سب سن رہی تھی، صرف کچھ کہنے کی قابل نہ رہی تھی۔ کاش..... کاش یہ سکتہ مجھے مکمل طور پہ جکڑ لیتا..... میں کچھ دیکھ نہ پاتی..... کچھ سن بھی نہ پاتی۔

"اب تو اپنی گندی زبان سے ان گندے تعلقات کو اس پاک رشتے کا نام نہ دو۔ وہ عورت تمہاری کیا کسی کی بہن بھی بننے کے قابل نہیں..... وہ کسی کی بیوی بننے کے قابل نہیں۔"

زریاب مسلسل اپنے زہریلے خیالات سے اسے اور بھڑکا رہا تھا۔ فیروز لالہ نے اس کی بندوق چھین کے اسے اور مشتعل کر دیا تھا۔ اب وہ ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے اس پہ وار کر رہا تھا۔ اس نے اچانک بندوق اپنی طرف کھینچنی شروع کر دی۔ اسی کھینچا تانی میں لالہ کی نظر دروازے پہ پڑی مجھے دہلیز پہ گرے دیکھ کے اس کی حرکت بس ایک لمحے کے لیے تھمی تھی۔ اس کے چہرے کی سرخ رنگت یکدم زرد پڑ گئی۔ میں نے ان آنکھوں میں شکست..... اور شرمساری کے سائے لہراتے دیکھے۔ شاید اسے اپنے وہ سارے دعوے یاد آئے تھے جو اس نے مجھے اس شادی پہ رضامند کرتے ہوئے کیے تھے یا پھر شاید بہن کے

UrduPhoto.com
Saba

سامنے ہی اپنے رشتے کی پامالی نے اسے پاتال میں گرا دیا تھا۔

اسے کمزور پڑتا دیکھ کے زریاب نے بندوق کی نالی کا رخ اس کی گردن کی طرف کر دیا۔ میرا دل اُچھل کے حلق میں آ گیا میں نے بے اختیار لالہ کے ڈھیلے ہوتے ہاتھوں کو بندوق پہ نیچے کی طرف پھسلتے ہوئے دیکھا، عجیب حسرت زدہ انداز میں مجھے دیکھ کے اس نے فائر کر دیا..... اور..... اور میرا دل حلق سے پھسل کر کہیں نیچے..... بہت نیچے گر گیا۔

میں جان گئی اس نے یہ فائر کیوں کیا تھا..... غیرت کا ایک رنگ یہ بھی تو ہے..... زریاب نے اس کی پاکیزگی پہ کیچڑ اچھالا تھا ایک بھائی کو گالی دی تھی..... وہ میرے سامنے ہی اتنی بڑی گالی سہہ نہ پایا، شرم نے اسے اپنی جان لینے پہ مجبور کر دیا۔ فائر کی آواز سن کے ملازم اندر چلے آئے۔ لالہ خون میں لت پت نیچے پڑا تھا۔ موت نے اسے ایک پل میں ڈھانپ لیا تھا۔ لوگوں نے بندوق پکڑے زریاب کو ہر طرف سے جکڑ لیا وہ ابھی بھی اسی کیفیت میں تھا۔

''چھوڑو مجھے..... میں کہتا ہوں چھوڑ دو مجھے۔''

''تم نے ہمارے صیب کو مار دیا۔ مار دیا اسے۔'' ہر طرف چیخ و پکار مچی تھی۔ کئی ملازم روتے چلاتے مردان خانے کے اندرونی حصے کی طرف دوڑے۔

''ہاں میں نے مارا ہے اسے۔ میں خود کہہ رہا ہوں میں نے مارا ہے اسے۔ اسے مارنا کوئی شرم کی بات نہیں جو میں چھپاؤں گا۔''

''میں بزدل نہیں ہوں، میں کہیں نہیں بھاگوں گا، مجھے چھوڑ دو ابھی ایک حساب باقی ہے ابھی مجھے اس کی جان بھی لینی ہے۔''

میرے اندر جیسے ایک زور کا پتھر آن گرا اور پھر سے میرے اندر جان پڑ گئی۔ میں نے سن ہوتے پیروں پہ کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ زریاب کے الفاظ نے مجھے ایک نئی راہ سجھائی۔ وہ اتنے طیش کے عالم میں تھا کہ یہ بھی محسوس نہ کر سکا، اس کے دونوں ہاتھ تو بندوق کی نالی پہ تھے۔ اس نے لالہ کے ہاتھوں کی حرکت دیکھی ہی نہیں۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ قتل اس نے کیا ہے اور اندر آئے ہوئے ملازمین بھی یہی سمجھ رہے تھے۔ دیکھا جائے تو ایک طرف سے یہ سچ بھی تھا لیکن میری نظر سے کون دیکھتا؟ میں نے نظر و عقل کے اس دھوکے کو برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا۔ حقیقت کیا تھی، یہ صرف میں اور لالہ جانتے تھے یا پھر خدا۔ فیروز لالہ کچھ کہنے کے قابل نہ رہا تھا اس کی شرم نے اسے منوں مٹی تلے منہ چھپانے پہ مجبور کر دیا تھا اور میں..... میں حقیقت کسی کو نہیں بتاؤں گی یہ میں نے طے کر لیا اور خدا تو ہے

ہی سب سے بڑا منصف..... یقیناً یہ سب فیصلے مجھ سے وہی کروا رہا تھا۔

میں نے مٹی میں پڑی چادر اٹھائی اور وہاں سے نکل بھاگی اب تک کسی کی نظر مجھ پہ نہیں پڑی تھی۔ کوارٹروں کے پچھلی طرف تندور کے پاس سے گزرتے ہوئے حواس باختہ سی لائی کو میں نے موہیے کی باڑھ پھلانگتے ہوئے دیکھا۔ وہ کبھی مردان خانے کے اس بیرونی حصے کی طرف نہیں گئی تھی لیکن حویلی میں مچے شور نے اسے ایسا کرنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ ''لائی..... لائی بہن.....'' فالسے کے گھنے پودوں کے بیچ چھپ کے میں نے اسے آہستہ آہستہ آوازیں دیں۔ وہ چونک پڑی، بڑی سی کالی چادر ذرا سی سرکا کے اس نے اپنی وحشت زدہ نگاہیں ادھر ادھر دوڑائیں۔

''مومنہ..... تم اور.....؟'' میں اس کا ہاتھ تھام کے گندم اور اناج والی کوٹھری میں لے آئی جہاں کی سراسیمہ حالت صاف بتا رہی تھی کہ فائر کی آواز اور ملازمین کے رونے پیٹنے نے اس کی اندر کی خدشات کو جگا دیا تھا۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں آنسوؤں سے بھری مجھ سے سوال کر رہی تھی۔

''کیا ہوا مومنہ؟ تمہارا لالہ وہ تو اندر تھا..... کہاں ہے تمہارا لالہ..... وہ ٹھیک ہے ناں؟'' میں نے اس کی بھری بھری کلائیاں، سرمے سے بھری آنکھیں اور دنداسے سے سرخ لب دیکھے۔ میری ہمت نہ پڑی کہ میں اپنی زبان سے اسے سہاگن سے بیوہ ہونے کی منحوس خبر سناؤں۔

''مجھ سے کچھ مت پوچھو لائی۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے ابھی اسی وقت یہاں سے جانا ہے اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' میں نے اپنے ننگے پیر اور خالی ہاتھ دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ مت سمجھنا میں اپنی جان بچا کے بھاگ رہی ہوں، وقت ملا تو ضرور تمہیں ساری بات بتاؤں گی فی الحال تو تم سے اپنے اور فیروز لالہ کے رشتے کے صدقے کچھ مانگ رہی ہوں۔'' وہ بڑی الجھن کا شکار تھی، کبھی میری بات سننے کی کوشش کرتی کبھی مڑ کے حجرے کے اس کمرے کو دیکھتی جہاں اتنے فاصلے سے بھی ہجوم بڑھتا دکھائی دے رہا تھا، اس کا سارا دھیان اسی طرف تھا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہاتھ سے طلائی کنگن اتارنے کی کوشش کی۔ ''یہ کیا کر رہی ہو؟'' وہ اور ہراساں ہو گئی۔

''لائی۔'' میں نے آنسو پیتے ہوئے کہا۔

''میں نے کہا ناں بہن میں ایک انجانے سفر پر جا رہی ہوں مجھے زادِ راہ چاہیے۔ خدا

Urdu.com
UrduPhoto.com
Saba

کا واسطہ ہے میری مدد کرو تمہیں لالہ کی قسم'' اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی کنگن اتارے۔ چادر کے پلو سے بندھے چند دس دس کے نوٹ نکالے، چپل اتار کے میرے آگے کی اور میرے گلے لگ کے اونچی اونچی آواز میں رونے لگی، شاید اس کے اندر کسی نے اسے اجڑنے کا اشارہ دے دیا تھا۔ دوبارہ اس نے مجھ سے لالہ کے بارے میں کچھ نہ پوچھا۔ میں نے اس سے رازداری کا وعدہ لیا اور وہاں سے فرار ہوگئی۔

اس وقت سارے علاقے کی توجہ حویلی پہ ہونے والے واقعے کی طرف تھی۔ میں بڑی آسانی سے سیدو شریف سے نکل گئی۔ پشاور جانے کے بجائے میں نے پنڈی کا رخ کیا۔ وہاں زریاب کا خطرہ کم تھا۔ پھر..... پھر میں نے نجانے کیا سوچ کے لاہور کا ٹکٹ لے لیا۔ میں اس وقت بالکل اکیلی تھی۔ تنہا لاوارث۔ میرا کوئی نہ تھا۔ نہ سر پہ چھت تھی نہ پیر کے نیچے زمین اپنی تھی۔ ایسے میں لاہور جانا میں نے مناسب سمجھا، شاید وہاں کی مٹی مجھے اپنی اپنی سی لگے۔ کہتے ہیں ہر انسان کی نسل باپ سے چلتی ہے، باپ کا حوالہ اس کی پہچان ہوتا ہے، میرا باپ یہیں کا تھا، اسی شہر میں یہیں میرے خون کے رشتے موجود تھے۔ بھلے وہ مجھے نہیں جانتے تھے، میں انہیں نہیں پہچانتی تھی لیکن وہ تھے تو سہی، اس شہر نے مجھے پناہ دی۔ لالئی کا دیا ہوا زیور کچھ دن میرے کام آیا۔ [illegible] دوران بھی اور اس نئی جگہ پہ بھی۔ لیکن پھر زندہ رہنے کے لیے مجھے نوکری کرنا پڑی۔

دن ایسے ہی گزر جاتے اگر موت مجھے خود وہ نہ کر دیتی۔ مجھے مرنے سے ڈر نہیں لگتا تھا، مجھے لاوارث مرنے سے ڈر لگتا تھا۔ میں نے لالئی کو پھر سے صدا دی۔ میں چاہتی تھی کوئی اپنا بڑی محبت سے مجھ پہ مٹی ڈالے، بڑے دل سے میری مغفرت کی دعا کرے اور قدرت نے مجھے میرے دو اپنے ملوا دیے۔ میرے لالہ کی آخری نشانی اور میری اپنی بیٹی..... میری بیٹی..... جو مجھ سے اتنی متنفر ہے کہ..... لیکن اس کا کیا قصور میں نے [illegible] ماں ہونے کا فرض ادا نہیں کیا تھا۔ ایسا نہیں تھا مقدس کہ میں بھول گئی تھی۔ تمہیں..... لیکن میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔'' وہ آس بھرے انداز میں سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی مقدس کو دیکھنے لگی۔

''میں اس واقعے کی عینی شاہد تھی۔ اگر کسی کو یہ پتا چل جاتا تو لازماً مجھے عدالتوں میں گھسیٹا جاتا اور مجھے خدشہ تھا کہ کٹہرے میں کھڑے زریاب کو دیکھ کے میں کمزور نہ پڑ جاؤں۔ میں نے کہا تھا ناں تم سے کہ میں اپنے اندر کی محبت کی ماری عورت سے ڈرتی ہوں۔ مجھے لگ رہا تھا تمہیں دیکھ کے میرے قدم نہ لڑکھڑا جائیں۔ شاید تمہارے سر سے

باپ کا سایہ کھینچنے کی ہمت نہ ہو سکے۔ شاید زریاب کے چہرے پہ پھیلا پچھتاوا مجھے نرم کر دے۔ محبتیں کمزور بنا دیتی ہیں، سمجھوتا کرنا سکھاتی ہیں۔ عشق عیب ڈھک دیتا ہے۔ میں نہ کمزور پڑنا چاہتی تھی نہ نرم ہونا۔ مجھے سمجھوتا نہیں کرنا تھا، بدلہ لینا تھا میں نے محبت مار دی اور نفرت زندہ رہنے دی۔ میرے کانوں میں اس کے الفاظ کی بازگشت سنائی دیتی، میری انا کو کچوکے لگتے۔

میرے رخسار کا داغ لو دینے لگتا اور دل میں پھر سے تپش بھڑک جاتی۔

اس کی گالیوں کے چھینٹے نظر آتے تو میری روح انتقام سے لتھڑ جاتی۔

میں چاہتی تو عدالت میں اپنے داغ دکھا کے اور ساری سچائی بیان کر کے اسے پشیمانی اور پچھتاوے میں مبتلا کر سکتی تھی۔ سچائی کے آگے بی بی جان کے بودے الزام کتنی دیر قائم رہتے لیکن اس سے کیا ہوتا، اس کے کہے الفاظ تو واپس نہ لوٹ جاتے، بے اعتباری کا داغ تو نہ مٹ جاتا۔ بے عزتی کا دکھ میری رگ رگ میں اتر چکا تھا۔ اب میری یادداشت ہی ساتھ چھوڑ دیتی تو میں یہ سب بھلا سکتی تھی۔ لیکن میں کچھ نہ بھولی..... صرف اپنا عورت ہونا بھول گئی، بیوی ہونا، ماں ہونا بھول گئی، صرف زریاب کو سزا دینا یاد رہا۔

میں بھاگ گئی۔ مجھے بھاگنا ہی تھا اگر موجود رہتی تو سچ بیان کرنا پڑتا اور شاید تب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا۔ وہ معافی مانگتا، پچھتاتا، روتا تو شاید..... مجھے اسے معاف بھی کرنا پڑ جاتا اور معافی اسے مطمئن کر دیتی۔ زریاب کو اطمینان مل جائے کیا یہی انصاف ہے؟ میں اسے غم میں جلتا دیکھنا چاہتی تھی چاہے اس کے لیے مجھے خود کو شعلوں پہ ہی کیوں نہ جلانا پڑتا۔

''صرف خود کو؟'' مقدس کے سوال پہ اس نے گہری سانس بھری۔

''میں مانتی ہوں میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے ساتھ ساتھ تمہیں بھی ایک امتحان میں ڈالا۔ لیکن میں پہلے بتا چکی ہوں کہ تمہیں تمہارے خاندان میں تمہارے اپنے لوگوں میں چھوڑتے ہوئے مجھے وہ فکر نہ تھی۔ اب میں کہاں جانتی تھی میرے نصیب کا کچھ حصہ تم بھی چرا لو گی۔ اجنبیت تمہاری سہیلی بھی بنے گی اگر مجھے پتا ہوتا تو میں تمہیں کبھی اکیلا نہ چھوڑتی لیکن اتنی دور تک تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ میرے دل و دماغ پہ تو اس وقت ایک ہی دھن سوار تھی۔

اب احساس ہو رہا ہے کہ اگر وقتی طور پہ زریاب کے [illegible] کے قابو میں نہ رہے تھے تو میں کب پورے ہوش و حواس میں رہی تھی۔ مقدس! میں اس کی تلافی کرنا چاہتی ہوں۔ میرا یہ اعتراف اس کا پہلا قدم ہے اور خوشنود تم اب جان گئے ہو گے کہ زریاب

UrduPhoto.com
Saba

تمہارے باپ کا قاتل نہیں ہے۔ اس نے خود اپنی جان لی تھی، حالات چاہے کیسے ہی رہے ہوں، ان کا ذمہ دار چاہے کوئی بھی ہو، بہر حال اسے خودکشی ہی کہیں گے۔"

"آج آپ یہ کہہ رہی ہیں اور کیوں کہہ رہی ہیں، میں جان گیا ہوں۔" اس نے کن انکھیوں سے مقدس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن پھپھو جان، میں تو آپ کی نظروں سے دیکھ رہا ہوں اور آپ نے ہی کہا تھا کہ میری نظر سے دیکھو وہ کتنے لوگوں کا قاتل ہے۔"

"اسے اس کی سزا بھی تو مل رہی ہے، قید میں بھی اور قید سے باہر بھی ایک مسلسل سزا اس کے تعاقب میں ہے ایک پچھتاوؤں سے بھری اجڑی ہوئی زندگی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ تم اس کی باقی سزائیں قدرت کے لیے چھوڑ دو اور اپنے اس خوبصورت دل کو صاف شفاف کر لو بالکل اپنے باپ کی طرح، بنا کسی نفرت کے، بنا کسی کدورت کے۔"

"میں کسی سے نفرت نہیں کرتا۔" اس نے اٹھ کے کلاس ونڈو تک جاتی مقدس کو دیکھا اور اپنی شکست کا اظہار کیا۔

"لیکن محبت..... اس کے لیے ابھی دل اتنا صاف نہیں ہوا کہ....."

مومنہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تم مقدس کو بھی میری نظر سے دیکھو۔ میری نظر سے دیکھو گے تو وہ دریا جیسی لگتی ہے، یہ بھول جاؤ گے۔" اس نے خوشنود کا مضبوط ہاتھ دباتے ہوئے اصرار کیا۔ اس کے کہنے پہ اس نے نظر اٹھائی۔ کمرے کے اس کونے میں موجود مقدس شیشے سے پرے تاریک میدان کو دیکھ رہی تھی۔ رات کے سائے گہرے ہو چکے تھے اور باہر موجود سنسان لان میں جلتے اکا دکا بلب کے ٹمٹماتے عکس شیشے پہ نمایاں ہو رہے تھے۔ ان جلتے بجھتے سایوں کے ساتھ مقدس کا چہرہ آج بھی اسے اتنا ہی روشن اتنا ہی منور لگ رہا تھا جتنا کہ پہلی بار اول محسوس ہوا تھا۔ اس کی خلا میں بھٹکتی آنکھوں کے نیلگوں آئینے رات کے اس سمے سیاہی مائل سے لگ رہے تھے اور موی انگلیاں بے دھیانی میں دیوار پہ نجانے کیا لکھ رہی تھیں۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ دھند چھٹتی رہی..... وہ اسے دیکھتا رہا اور گرد صاف ہوتی رہی..... وہ اسے دیکھتا رہا اور روشنیاں دل میں اترتی گئیں۔

"میرا دل..... ہاں میرا دل شفاف ہے۔" اسے احساس ہوا تو اعتراف کرنے مڑا، مومنہ کی آنکھ لگ چکی تھی۔ دواؤں کے زیر اثر اس کے اعصاب اس کے کنٹرول سے باہر تھے۔ یہ محض اس کی اپنی قوت ارادی تھی جو وہ نہ صرف اتنی اتنی دیر عالم ہوش میں رہ جاتی

تھی بلکہ یادداشت کی زنبیل سے برسوں پرانے واقعات بھی ڈھونڈ لاتی تھی۔ اس نے کمبل درست کر کے اوڑھایا اور چپکے سے مقدس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ دیوار پہ حرکت کرتی اس کی انگلیوں پہ غور کیا وہ بے دھیانی میں ماں لکھتی چلی جا رہی تھیں۔

"ماں.....!" اس نے سرگوشی کی تو وہ چونک کے مڑی۔ خوشنود نے اسے انگلیاں مسل کے مٹھی بھینچتے ہوئے دیکھا۔

"سزائیں دینے کا یہ عمل کب تک جاری رہے گا مقدس، کیا سزا اور سزا ہمارے نصیبوں میں لکھ دی گئی ہے۔ کسی نے اپنی محرومیوں کی سزا ایک گلاب چہرہ جھلسا کے دی۔ کسی نے اپنی عزت پہ حرف آتے دیکھ کے ایک باوفا شخص کو اذیت ناک موت کی سزا دی، کسی نے انتقام کے جذبے سے مغلوب ہو کے ایک جذباتی شخص کو اس کے جرم سے بڑھ کے سزا دی اور تم..... تم مقدس اس ماں کو کیوں سزا دے رہی ہو اسے ماں نہ تسلیم کر کے۔ جانتی ہو وہ زندہ ہی شاید صرف اس لیے ہے کہ تم ایک بار تمام شکوے بھلا کے ان کے گلے لگ جاؤ ورنہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مجھے ان کی حالت دیکھتے ہوئے زندہ رہنے کی اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

مقدس ان کی سانسیں آسان کر دو۔ اس وقت تو اجنبیت کے بجائے اپنائیت کی آغوش ملنی چاہیے انہیں۔"

وہ رو پڑی..... سسک سسک کی رو پڑی۔

"رو لو مقدس جی بھر کے رو لو..... کبھی کبھی دھندیں بھی چھٹتی ہے، کبھی کبھی گردیں بھی صاف ہوتی ہے، میں مرد ہوں، رو نہیں سکتا، جانتی ہو میں نے اپنے دل کا آئینہ شفاف کیسے کیا۔" اس کے سوالیہ انداز میں دیکھنے پہ وہ اس کی گہری آنکھوں میں بھرپور انداز سے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ کئی روز کے تناؤ کے بعد اس کے تھکے تھکے چہرے پہ یہ مسکراہٹ مقدس کو بڑی نکھری ہوئی لگی۔

"میں نے تمہیں دیکھا اور دھند چھٹ گئی۔"

☆☆☆

"دراب، بچیوں کو اطلاع بھجوائی؟" افراسیاب خٹک نے پچھلے ایک گھنٹے میں کوئی چوتھی بار دریافت کیا اور نفی میں جواب ملنے پہ جھنجھلا گئے۔

"میں کیا کر سکتا ہوں لالہ؟ ہاسٹل سے یہی جواب ملتا ہے کہ وہ دو دن سے نہیں آئی البتہ کل اس نے فون پہ انتظامیہ سے بات کر کے مزید دو دن کی غیر حاضری کی اجازت لے لی ہے۔"

UrduPhoto.com
Saba

"اور شناور؟"

"اس کے ہاسٹل بھی فون کیا ہے وہ اس وقت وہاں موجود نہیں"

"اتنی صبح صبح تو کالج بھی نہیں کھلتا وہ کہاں چلی گئی۔" اس سوال کا جواب تو دراب کے پاس بھی نہیں تھا۔ رات کے پہلے پہر باچا جان کی وفات ہوئی تھی، اس وقت انہوں نے گرلز ہاسٹل فون کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ رات سے ہی برادری کے لوگوں کی آمد شروع ہوگئی تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق باچا جان کو زیادہ دیر تک رکھا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اور صبح فجر سے لے کر اب تک وہ لاہور میں مقدس اور شناور سے رابطہ کرنے میں ناکام رہے تھے۔ آخر کار افراسیاب خٹک نے فیصلہ سنا دیا۔

"رابطہ کی کوشش جاری رکھو۔ انہیں آج ہی اطلاع ملنا تو لازمی ہے البتہ ان کے انتظار میں باچا جان..... میرا مطلب ہے اب ان کی روانگی کا انتظام کیا جانا چاہیے۔"

زریاب اور بی بی جان دونوں صدمے سے نڈھال اس سارے مسئلے سے بے خبر تھے۔ بیس سال کی قید میں ایک ساکت و جامد زندگی گزارنے کے بعد زریاب کے لیے رہائی کے فوراً بعد ملنے والے پے در پے جھٹکے شدید ثابت ہوئے تھے اس کا دھیان ہی اس طرف نہیں گیا البتہ تجہیز و تکفین کے بعد بی بی جان ذرا سنبھلیں تو ٹھٹھک کر رہ گئیں۔

"کسی نے لاہور اطلاع نہیں بھجوائی بچیوں کو؟"

زریاب بھی چونکا اور دراب کے تفصیلی جواب نے دونوں کو نئی فکر میں ڈال دیا۔

"کہاں جاسکتی ہے مقدس دو چار دن کے لیے ایسا تو کبھی نہیں ہوا اور شناور وہ تو کالج سے چار بجے تک آجاتی ہے میں عموماً اسی وقت اسے فون کیا کرتی ہوں پھر اب شام کے سات بجنے والے ہیں اور وہ ابھی غائب ہے۔" بی بی جان بڑبڑا رہی تھیں۔

"اور کالج بھی نہیں گئی ہے وہ آج۔ یہ بھی پتا چلا ہے۔" دراب نے کہا۔

"کہاں جاسکتی ہیں دونوں بغیر بتائے۔" وہ کہہ رہی تھیں۔

زریاب مضطرب سا ہو کے ٹہلنے لگا۔ بڑی دیر سے ہاتھ مسل کے کچھ کہنے کی ہمت مجتمع کرتی ہوئی زبیدہ بیگم فیصلہ کن انداز میں اٹھیں۔

"وہ دراصل میرے پاس..... میرے پاس شانو کا موبائل نمبر ہے۔"

"موبائل نمبر؟ اس نے موبائل فون کب سے رکھنا شروع کر دیا۔" دراب نے ماتھے پہ بل ڈال کے پوچھا۔ اس کی اپنی ایک مخصوص سوچ تھی جس پہ بیرون ملک کی تعلیم اور طویل قیام بھی اثر نہ ڈال سکا تھا اور حقیقت میں شناور اپنے اس چھوٹے ماموں سے خائف ہو کے ہی موبائل فون سب سے چھپا کے رکھنے پہ مجبور ہوئی تھی کہ یہ اس کی ضرورت تھی۔

"اوہو یہ وقت اس بحث کا نہیں۔ تم جلدی سے اسے کال کرو۔" افراسیاب نے معاملہ ختم کیا۔

ہال کمرے میں بچھی چاندنیوں پہ، کافور اور اگربتیوں کی مہک کے ساتھ وہ تمام لوگ اس وقت ٹکٹکی باندھے فون پہ بات کرتی زبیدہ کو دیکھ رہے تھے۔

"اس وقت اطلاع کر تو دیتے لیکن تم دونوں اپنے اپنے ہاسٹل میں تھیں ہی کب؟" شناور نے باچا جان کی وفات کی خبر سنتے ہی جو سوال کیا تھا، وہ اس کا جواب دے رہی تھیں۔ "اچھا بیٹا صبر کرو، دعا کرو اپنے باچا جان کے لیے، اس طرح رونے سے وہ واپس تو نہ لوٹ آئیں گے۔ شاباش چپ ہو جاؤ اور مقدس کا بتاؤ وہ کہاں ہے..... کیوں غائب ہے اتنے دنوں سے ہاسٹل سے اس کی غیر حاضری کا سن کے سب ہی فکر مند ہیں۔" اسے چپ کراتے کراتے انہوں نے پوچھا اور جواب میں جانے اس نے کیا کہا تھا کہ وہ حیرت کی زیادتی سے صوفے پر سے اچھل کے کھڑی ہو گئیں۔

"کیا کہا تم نے..... وہ ماں کے پاس؟"

"کب؟ کیسے؟"

"کہاں ملی تھیں؟"

سب لوگ اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کے قریب چلے آئے ماسوائے زریاب کے۔ وہ وہیں بیٹھا خود کو ایک نئی خبر کے لیے تیار کرنے لگا۔ زبیدہ نے فون کریڈل پہ رکھا اپنی حیرت سے بھری نظریں سب پہ دوڑائیں۔

"مومنہ..... زریاب کی بیوی مل گئی..... مقدس اسی کے پاس ہے۔" ان کے لہجے میں ابھی تک بے یقینی تھی۔

"وہ شناور یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اس کی حالت بہت نازک ہے۔ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے مقدس بھی اسی وجہ سے ہاسٹل سے غیر حاضر ہے۔" انہوں نے مزید بتایا کسی نے کوئی تبصرہ نہ کیا سب کی نگاہیں زریاب کے چہرے پہ جمی تھیں، جہاں اس وقت زلزلے کے آثار نمایاں تھے۔ بی بی جان نے آگے بڑھنے کی ہمت کی۔

"زر، میرے بچے یہی وقت ہے، اس وقت کو روک لو ورنہ پھر کچھ باقی نہ بچے گا، عمر بھر کے پچھتاوے کے سوا۔ خدا اسے زندگی دے، اتنی کہ ہم لوگ اس کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کی تلافی تو کر سکیں اور کچھ نہیں تو اس سے معافی تو مانگ سکیں۔ اٹھو زر، جاؤ اس کے پاس..... قسمت سے یہ موقع ملا ہے، اسے کھونا مت۔"

Urdu.com
UrduPhoto.com
Saba

"لیکن بی بی جان میں کیسے؟" اس نے گھر کے افسردہ ماتمی ماحول پہ اک نظر ڈالی۔ "ابھی صبح باچا جان کی تدفین ہوئی ہے، گھر لوگوں سے بھرا پڑا ہے، کل ان کے قل ہیں اور میں یہاں سے چلا جاؤں"

"جانے والے تو چلے گئے زریاب۔" افراسیاب نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔ "جو جا رہے ہیں انہیں روک لو۔ اسے تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔ سوچنے میں وقت ضائع مت کرو اور جانے کی تیاری کرو۔"

☆☆☆

ننگے پندے مینوں چمکاں مارے
تے میرے روندے نیں نین نمانے
جنیاں تن میرے تے لگیاں
تینوں اک لگے تے توں جانے
غلام فریدا دل اوتے دیئے
جتھے اگلا قدر وی جانے

(جتنی میرے تن پہ لگی ہیں تمہیں ایک بھی لگے تو پتہ چلے۔ غلام فرید دل اسے دینا چاہیے جو اس کی قدر بھی جانے)

نیم بے ہوشی کے عالم میں اسے اپنے ابا کی درد میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

یہ گیت..... یہ گیت ابا نے کتنی بار اسے سنایا تھا اور وہ بغیر مطلب جانے سمجھے، خود بھی درد کے اک گہرے سمندر میں بہنے لگتی تھی پھر کتنے دنوں بعد جب زریاب سے اس گیت کا مطلب سمجھا تب بھی دکھ کی ہلکی ہلکی سی کہر نے اسے ڈھانپنا چاہا لیکن اس نے جھٹک کے اس دکھ بھرے احساس کو پرے کر دیا ان دنوں تو وہ صرف خوش رہنا چاہتی تھی اور جب اس کہر نے اس کے گرد اپنا جال بننا شروع کر دیا، اسے ہر طرف سے غم کی دھند میں لپیٹ دیا تب اس گیت کے بولوں نے نئے نئے راز کھولے۔ آج ابا کی آواز اسے اوپری اوپری سی نہ لگ رہی تھی۔ آج اس کا ہر لفظ اس کے دل میں اتر رہا تھا۔

"ابا!" اس کے لبوں سے کراہ سی نکلی اور پھر سے ذہن بے ہوشی کی وادیوں میں کھو گیا۔

اے میرے محبوب!
میری آنکھیں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔
لوٹ آؤ۔
میں تمہاری تھکن اپنے ہاتھوں میں سمو لوں۔

ماں کی آواز میں "برہ" اسے سنائی دیا۔ "ماں..... ماں!" اس نے ذہن کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ہاتھ مارتے ہوئے ماں کو تلاش کرنا چاہا۔ اس کی "کوپیسی" پہ لگی سیپیاں کھنک اٹھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے ماں کے "پوشش" کا دامن تھامنا چاہا۔

"ابھی نہیں میری لاڈلی، بس کچھ دیر اور....." ابا نے بھی نگاہوں ہی نگاہوں میں تسلی دی۔

☆☆☆

"ماموں!" وہ دیئے ہوئے پتے پہ پہنچ کے کچھ دیر کے لیے رکا۔ سر اٹھا کے اس سفید عمارت کو دیکھ رہا تھا جس کے اندر "وہ" موجود تھی جب ایک اشتیاق بھری آواز پہ پلٹا۔ سبز کاٹن کے مسلے ہوئے سلوٹوں سے بھرے لباس میں ملبوس وہ کم عمر سی لڑکی اپنے سنہری چہرے پہ بے پناہ اشتیاق لیے اس سے ہی مخاطب تھی۔

"مقدس؟" اس نے سوچنا چاہا لیکن اس کی زردی مائل سبز آنکھوں کو دیکھ کے خود ہی تردید کی۔ آنکھیں تو کسی اور کی یاد دلا رہی تھیں۔ رحیم گل آفریدی کی.....

وہ چونکا۔

"ماموں!" اب کے اس نے پورے دھیان سے اسے سنا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے بازو پھیلا دیئے۔

"[illegible]" دونوں [illegible]" اس کے سینے سے لگتے ہوئے اس نے سرگوشی کی۔

زریاب کا رواں رواں [illegible] لگا۔

"بس کچھ دیر اور..... چند لمحوں بعد..... وہ دونوں میرے سامنے ہوں گی۔" اس کا دل یہ سوچتے ہی اچھل اچھل کے یہ چند قدموں کا فاصلہ ایک ہی قدم میں طے کرنے پر اکسانے لگا اور جب سچ مچ ایک ہی قدم کا فاصلہ رہ گیا تو وہ رک گیا۔

[illegible] دور میں ماربل کے پلر کے ساتھ ٹیک لگائے وہ بلاشبہ مقدس ہی تھی۔ اس نے [illegible] کے گلاسوں کے گرد ہیروں کی کنیاں دمکتی دیکھ لی تھیں۔ اگر اللہ ان آنکھوں میں نیلاہٹیں اتارنے کے بجائے شہد رنگ چشمے ٹھہرا دیتا تو کون پہچان پاتا یہ مومنہ ہے یا مقدس۔

"بابا جان" اس نے زریاب کے پھیلے بازو دیکھے تو الجھ سی گئی۔ ذہن میں کہیں خوشنود کے الفاظ نے سہارا دیا۔

"سزائیں دینے کا یہ عمل کب تک جاری رہے گا۔" اس نے باپ کی پیاسی آغوش میں جانے میں دیر نہ لگائی۔ ماں کی ممتا کو تسکین پہنچانے میں اس نے جو ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تھا، اس کا خمیازہ وہ ایک کسک کی صورت بھگت رہی تھی۔ اس وقت اس کی ماں زندگی کی آخری بازی کھیل رہی تھی۔ اور وہ باہر کھڑی اللہ سے بس ایک لمحہ مانگ رہی تھی۔ بس

UrduPhoto.com
Saba Urdu.com

ایک لمحہ جس میں وہ ماں کو جاتے جاتے اپنی محبت کا یقین دلا جائے۔ اندر خوشنود ڈاکٹر محمود کے ساتھ مل کے وہ ایک لمحہ بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مومنہ کی بے ہوشی طویل ہو چکی تھی۔

"میں ایک بار اپنے سر پر باپ کے ہاتھ کا سایہ محسوس کرنا چاہتی ہوں۔ میں جاننا چاہتی ہوں وہ ٹھنڈک کیسی ہوگی جو ان ہاتھوں تلے پھیلی چھاؤں میں ہے۔"

کچھ ہی روز قبل فجر کی نماز میں کی گئی دعا کے الفاظ اس کے چاروں طرف گونجنے لگے۔ سر پر رکھی زریاب خٹک کی ہتھیلی سے ٹھنڈک اس کی پوری پور میں اترنے لگی۔ اسے اپنی دعا کے پورا ہونے کا یقین ہو گیا۔ وہ ایمان لے آئی کہ اس دعا کا دوسرا حصہ بھی ضرور پورا ہوگا۔

اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے باپ کے خدوخال میں وہ عکس ڈھونڈنے چاہے جو بچپن سے گھر میں لگی قد آدم تصاویر میں دیکھتی چلی آ رہی تھی۔ اس کے وجیہہ سراپے پہ لٹنے کا غم نمایاں تھا۔ چہرے پہ پچھتاووں کی گہری لکیریں تھیں۔ بے نور آنکھوں کے گرد حلقے تھے اور چوڑے شانے ڈھلکے ہوئے تھے۔

"مما تمہیں خزاؤں کے حوالے کر کے یہ بھی اجڑے ہی رہے ہیں۔"

"مقدس!" کمرے سے نرس کے ہمراہ نکلتے ڈاکٹر خوشنود نے آواز دی۔

"فیروز!" زریاب کو ایک اور جھٹکا لگا اور وہ بے یقینی سے اس نوجوان کو دیکھنے لگا۔

"پھوپھی جان، ہوش میں آ گئی ہیں لیکن..... لیکن ابھی کوئی بھی بات نہیں کی جا سکتی، تم چاہو تو ان سے مل سکتی ہو۔" اسے ایک دراز قامت مگر تھکے تھکے انسان کا ہاتھ تھام کے اندر جاتے دیکھ کر اس نے روکا۔

"تم اکیلی ان سے مل سکتی ہو مقدس۔ میں نے کہا ناں ان کی حالت بہت نازک ہے۔" وہ کچھ کچھ پہچان رہا تھا۔

"بابا جان!" اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہنا چاہا۔ جواباً زریاب نے ایک سرد آہ بھری۔

"کیا میرے نصیب میں پچھتاووں سے رہائی نہیں لکھی۔ مقدس..... میری بیٹی اپنی ماں سے مجھے معافی دلا دو۔" وہ ہاتھ جوڑ کے تقریباً بلک اٹھا۔

"میں تو مر بھی نہیں سکوں گا اگر اس نے مجھے معاف نہ کیا....."

مومنہ کی آتی جاتی اکھڑی سانسیں دیکھ کے مقدس تڑپ گئی۔ اس نے ماں کے برف ہوتے پیر تھام لیے۔

"مما..... مما....." مومنہ نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھوں کے دھندلے

ہوتے شیشوں پہ مسکراہٹ کا عکس جھلملایا۔ خوشی کی چمک نے اس کے زرد چہرے کو یکا یک جگمگا دیا۔ اس کے لبوں نے پھڑپھڑا کے اسے پکارنا چاہا لیکن وہ وہیں دوزانو بیٹھ کے اس کے پیر چومنے لگی۔

"میری پیاری مما..... میری مما مجھے معاف کر دیں مجھے معاف کر دیں میں نے آپ کو کتنا دکھ دیا۔ آپ بانہیں پھیلا پھیلا کے مجھے بلاتی رہیں اور میں بے ثمر حسابوں میں کھوئی رہی..... میں کتنی بدنصیب ہوں ماں کے ملنے کے بعد بھی اس کی قدر نہ کی۔"

اس کے آنسوؤں نے مومنہ کے پیر بھگو دیے۔ وہ بولنے کی سکت نہ رکھتی تھی۔ بدقت ہاتھ اٹھا کے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ یوں بجلی کی طرح اس کے بازوؤں میں گئی جیسے اس ملاقات کا ایک پل بھی ضائع نہ کرنا چاہتی ہو۔ مومنہ نے کپکپاتے ہاتھوں میں اس کا جھکا چہرہ تھام لیا اور لبوں سے اس کے ماتھے پہ ایک دعا ثبت کر دی۔

"میں جاننا چاہتی ہوں کپکپاتے لبوں کا وہ بوسہ کتنا حیات بخش ہوتا ہوگا جو اولاد کے ماتھے کا مقدر بنتا ہے۔ میں جاننا چاہتی ہوں وہ گرمی کتنی پرسکون ہوگی جو ماں کی بانہوں کی پناہ میں ہے۔"

آخر میں کی دعا کا یہ آخری حصہ بھی پورا ہو گیا تھا۔ اسے اپنی دعا کا وہ آخری جملہ یاد آیا۔ "بس تھوڑی سی چھاؤں..... یا اللہ ذرا سی گرمی۔ بس اک بوسہ..... یا اللہ بس اک دعا۔" وہ کانپ گئی۔

"کیوں میں نے بس ایک دعا کی طلب کی؟ کیوں میں نے بس ایک بوسے کی، ذرا سی گرمی کی خواہش کی۔

نہیں، نہیں..... بس ایک بوسہ تو نہیں۔" وہ خوفزدہ ہو کے ماں کو پکارنے لگی۔

"مما..... مما آنکھیں کھولیں آپ نے پھر سے آنکھیں کیوں بند کر لیں۔ دیکھیں مما باہر کون آیا ہے..... بابا جان آئے ہیں آپ کے پاس خود چل کے آئے ہیں اپنی تمام غلطیوں کا اعتراف کرنے..... آپ کی ہر بات کی سچائی پہ ایمان لانے کے لیے.....

اٹھیں مما..... پلیز ان سے مل لیں۔ ایک بار مل لیں وہ شرمندہ ہیں، ہارے ہوئے ہیں، انہیں اپنی زیادتیوں کا احساس ہو گیا ہے۔ آپ بھی ان کی سزا معاف کر دیں مما۔"

"مما خدا کے لیے..... میری خاطر اب تو اپنے دل کو نرم کر لیجیے۔ معاف کر دیں انہیں۔ خدا بھی بڑی سے بڑی خطا معاف کر دیتا ہے اور معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ انہیں آپ کی پاکیزگی کا یقین ہے۔ آپ کو اور کیا چاہیے۔ بس کریں اپنے دل کو جلانا..... بس کریں یہ نفرت کا کھیل، نکال پھینکیں اپنے دل سے یہ کالے پھول....." اس

UrduPhoto.com
Saba

کے مسلسل اصرار پہ مومنہ نے ہار مان لی۔ اس کے لبوں پہ ایک بے بس خاموشی تھی۔

"مومنہ!" زریاب نے پکارا۔ اس کے چہرے کے بدلے نقوش دیکھ کے اس کے دل پہ گھونسا پڑا۔ پچھلے دنوں میں اس نے بڑی سے بڑی اندوہناک خبر سنی تھی کئی حادثے جھیل لیے تھے لیکن..... لیکن اس گلابی ریشمی چہرے کی جگہ ادھ جلا سا نولا پڑتا زرد چہرہ دیکھ کے اس کے دل پہ جو قیامت گزری تھی وہ سب سے اذیت ناک تھی۔

"اور کیا ان اندھیرے دریچوں کے پیچھے اب بھی شہد کی جھیل آباد ہے۔"

"مومنہ! ایک بار تم نے پوچھا تھا۔ پھولوں کے رنگ کالے کیسے ہو جاتے ہیں۔ میں صحیح طرح بتا نہ پایا تھا، شاید سب میں جانتا ہی نہیں تھا۔ آج میں تمہارے سوال کا جواب دینے کے قابل ہوں۔ سنو مومنہ، پھولوں کے رنگ کالے نہیں ہوتے..... پھول کبھی کالے نہیں ہوتے، کالک تو دلوں پہ مل دی جاتی ہے۔ سیاہی تو روح میں اتر جاتی ہے۔ اندھیرے تو نظروں پہ چھا جاتے ہیں، اتنی تاریکی میں جو بھی دیکھو کالا ہی لگتا ہے۔ ایسے ہی اندھیرے مجھ پہ بھی چھا گئے تھے۔ میرے دل پہ، عقل پہ، شعور پہ، ہر جگہ سیاہی مل دی گئی اسی لیے مجھے تمہارا دامن کالا نظر آیا۔ لیکن تم میلی کیسے ہو سکتی تھیں۔ پھول کبھی کالے نہیں ہوتے۔ پھول کالے نہیں ہوتے۔" وہ جھکے جھکے لیکن بے حس و حرکت وجود میں اب بھی زندگی کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔

"مومنہ..... مومنہ" وہ وحشت زدہ سا چلا اٹھا۔ مقدس اور خوشنود اس کی آواز کی گونج سے چونک کے اندر کی طرف لپکے۔

"مومنہ! تم ایسے نہیں جا سکتیں۔ تم مجھے معاف کیے بغیر کیسے جا سکتی ہو۔ تم مجھے اتنی لمبی سزا کیسے سنا سکتی ہو۔ تم اتنی پتھر دل کیسے ہو سکتی ہو مومنہ، مومنہ! تمہیں خدا کا واسطہ لوٹ آؤ۔ مجھے اس قید سے نجات دلا دو۔ اس سنگباری کو رکوا دو۔"

وہ گر پڑا تھا اور اس کے بے جان وجود سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ مقدس نے آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ آگے بڑھ کے ماں کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا۔

"تمہارے اندر کی عورت جیت گئی ماں، تم مر گئیں، لیکن تم نے اپنی نفرت مرنے نہ دی۔ شاید یہی نفرت تمہاری زندگی تھی لیکن میں جانتی ہوں تم بزدل تھیں۔ تم خود کو جتنا مرضی کٹھور ثابت کر لو تم ایک بزدل عورت تھیں۔ اس بزدلی نے تمہیں مرنے پہ مجبور کیا۔ اگر زندہ رہتیں تو نفرت مر جاتی۔ ہے ناں ماں؟ سچ سچ بتاؤ تمہاری نفرت مرنے لگی تھی ناں؟"

ختم شد

urdu.com
UrduPhoto.com